اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

دسمبر ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۸ء/ ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ

مشمولات

O ربیع الاوّل کا پیغام

نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم — عنایت علی خان — ۴

O فکر و نظر

اسلام کے نظامِ قضاء پر اتنا کڑا وقت شاید پہلے کبھی نہیں آیا — ۵

O پاکستانیات

چیف جسٹس آف پاکستان کی خدمت میں — مدیر — ۷

O پاکستان میں توہینِ رسالت

- ہماری دینی قوتوں کی ایک اور بڑی پسپائی — ۸
- آسیہ مسیح کیس - ایک تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر محمد امین — ۹
- دینی قوتوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ — ۲۵
- پاکستان میں توہینِ رسالت - چند ناگفتہ بہ حقائق — ابوالحسن علوی — ۲۷

O تعلیم و تربیت

- بعض دینی مدارس تجدد کی نرسریاں ..... — پروفیسر طارق بٹ — ۳۵
- برطانوی شاہی خاندان کا ABC سکھانے کا قاعدہ — ادارہ — ۳۷
- دینی مدارس اور حکومتی عزائم — حافظ ساجد انور — ۳۹

O تزکیۂ نفس

- بچوں کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ — سلیم طارق لون — ۴۳
- تزکیۂ نفس اور جدید اسلامی تحریکیں — حافظ موسیٰ بھٹو — ۴۵

O استفسارات

- جماعت اسلامی بند گلی میں — مدیر — ۵۰
- جماعت اسلامی کے ارکان و کارکنان کیا کریں؟ — ۵۲

O اسلام اور پاکستان

- مولانا سمیع الحق شہید - ابوالمجاہدین — فاروق عادل — ۵۴
- اسرائیل جیت گیا، پاکستان ہار گیا — عبدالرشید ارشد — ۵۷

ربیع الاوّل کا پیغام

نعتِ رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

کسی غم گُسار کی محنتوں کا یہ خوب مَیں نے صلہ دیا
کہ جو میرے غم میں گھلا کیا اُسے میں نے دِل سے بھُلا دیا

جو جمالِ روحِ حیات تھا، جو دلیلِ راہِ نجات تھا
اُسی راہبر کے نقوشِ پا کو مسافروں نے مٹا دیا

میں تیرے مزار کی جالیوں ہی کی مدحتوں میں مگن رہا
تیرے دشمنوں نے ترے چمن میں خزاں کا جال بچھا دیا

تیرے حسنِ خلق کی اک رمق میری زندگی میں نہ مل سکی
میں اسی میں خوش ہوں کہ شہر کے درو بام کو تو سجا دیا

تیرے ثور و بدر کے باب کے مَیں ورق اُلٹ کے گزر گیا
مجھے صرف تیری حکایتوں کی روایتوں نے مزا دیا

یہ میری عقیدتِ بے بصر، یہ میری ریاضتِ بے ہُنر
مجھے میرے دعویٔ عشق نے نہ صنم دیا نہ خدا دیا

تیرا نقشِ پا تھا جو رہنما تو غبارِ راہ تھی کہکشاں
اسے کھو دیا تو زمانے بھر نے ہمیں نظر سے گرا دیا

کبھی اے عنایتؔ کم نظر تیرے دل میں یہ بھی کسک ہوئی
جو تبسمِ رخِ زیست تھا، اُسے تیرے غم نے رُلا دیا

(عنایت علی خان)

فکر و نظر

کہ دل در سینۂ ملاّ گدازیم

اسلام کے نظامِ قضاء پر اتنا کڑا وقت شاید پہلے کبھی نہیں آیا

فرمایا حضرۃ العلاّم، فقیہ العصر، مجتہد اعظم، مجدد ملّت، قاضی القضاۃ مملکت خداداد پاکستان حضرت مولانا ثاقب نثار مدظلہ العالی نے اپنے اس تاریخی فیصلے میں جو ۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو جاری ہوا کہ نا ہنجارو! بدبختو! نبی پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان کو پہچانو کہ آپ کے ناموس کے تحفظ کی قسم خالق کائنات خود اٹھاتا ہے۔ آپ نے قرآن وسنت سے دلائل کے دریا بہا دیے اور ان بے ادبوں کے منہ بند کر دیے جو شانِ مصطفیٰ کے تحفظ میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔ آپ نے دلائل قاطعہ سے ثابت کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ناموس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے اور جو بدبخت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی شان میں ذرا بھی گستاخی کرے اس کے بارے میں آپ نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ وہ واجب القتل ہے، وہ دھرتی کا بوجھ ہے۔

اور اسی جلالتِ علمی کا مظاہرہ کیا حضرت فقیہ الملّت، محقق العصر، عالم بے بدل، غزالیٔ دوراں حضرت آصف سعید خان کھوسہ صاحب قاضی عدالت عظمیٰ مملکت خداداد پاکستان نے اور ہم جیسے ناکاروں کو بتایا کہ قرآن وسنت اقلیتوں کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں لہٰذا ان کا دل نہ دکھاؤ، ان کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ آپ نے قرآن وسنت کے مسکت دلائل سے یہ ثابت کیا کہ آسیہ مسیح جیسے عیسائیوں سے حسن سلوک ہم مسلمانوں پر فرض و واجب ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ ہے اور جناب نے ہم جیسے اَن پڑھوں کو اپنی تحقیق انیق سے بہرہ ور کرتے ہوئے ایک عظیم محقق جان اے مورو کی کتاب ’’پیغمبر اسلام حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے دنیا کے عیسائی مسلمانوں سے کیے گئے معاہدات‘‘ کے بارے میں بتایا ہے جس کی رو سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عیسائیوں سے ایک معاہدے میں فرمایا ’’خدا کی قسم! مَیں ہر اس عمل کے خلاف ہوں جو انہیں ناخوش کرے.... ان پر کوئی پابندی نہیں.... جو کوئی ان کے مال میں سے کچھ لے گا وہ اللہ سے معاہدہ شکنی کرے گا اور اس کے پیغمبر کی نافرمانی کرے گا کہ یہ درحقیقت میرے دوست ہیں۔‘‘

ان جلیل القدر عالموں اور بے مثل محقق قاضیوں کے سامنے کچھ عرصہ پہلے بھی اسی طرح

کا ایک کیس آیا تھا جس میں ایک گارڈ نے مملکت خداداد پاکستان (جس کے بانیوں نے اپنی کور نگاہی سے عصر حاضر کے نیشنلزم اور جمہوریت جیسے عظیم فلسفوں کو رد کرتے ہوئے دو قومی نظریہ پیش کیا اور پاکستان کو اسے ایک اسلامی نظریاتی ریاست قرار دیا تھا) کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے گورنر کو ناموس رسالت کے نام پر قتل کر دیا تھا۔ اس وقت بھی وقت کے ان عظیم منصفوں نے پہلے تو کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے اسلامی کیس وفاقی شرعی عدالت میں جانے چاہئیں کہ ہم شریعہ کے ماہر جج تھوڑی ہیں، ہم نے تو مغربی قانون پڑھا ہے اور تمام عمر اس کی تشریح کرنا سیکھا ہے۔ تاہم دوسرے دن انہوں نے ہمت مجتمع کی اور اس کیس کا فیصلہ سنانے کا ارادہ کر لیا اور یہ تاریخی فیصلہ دیا کہ یہ نہ ہنجار گارڈ تو ڈیوٹی پر تھا اور اس کا فرض تھا کہ گورنر صاحب کی حفاظت کرتا الٹا اس نے اپنے باس پر گولی چلا دی لہٰذا اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ اس وقت بھی سارا مغرب اس فیصلے پر عش عش کر اٹھا تھا اور سب نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے تھے۔

اس طرح کے تاریخی فیصلے اس طرح کے امامین جلیلین عظیمین ہی کر سکتے ہیں لیکن وہ کیا ہے کہ کورٹ میں ان کے نائبوں کو ذرا عربی نہیں آتی کہ آج کل اس کا زیادہ رواج نہیں رہا۔ چنانچہ قاضی القضاۃ صاحب نے جب فیصلہ لکھنا شروع کیا تو شروع میں تجدید ایمان ضروری سمجھی (حالانکہ کسی جاہل ملّا اور متعصب مولوی نے ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا تھا بلکہ ان مولویوں کو اس کی جرأت تو اس طرح کے تاریخی فیصلوں کے بعد بھی نہیں ہوئی سوائے ایک آدھ بے مغز مولوی کے، جو بہر حال ایک استثنائی معاملہ ہے)۔ اس میں آپ نے کلمۂ شہادت ادا فرمایا جس کے آخر میں آتا ہے [illegible] تو ان کے کسی نائب نے اس کا ترجمہ کر دیا "مَیں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے آخری نبی ہیں۔" اسی طرح کا علمی لطیفہ محقق العصر حضرت العلام کھوسہ صاحب کے نائب سے بھی سرزد ہوا جس نے "آسیہ" کا ترجمہ "گنہ گار" کر دیا حالانکہ اسے 'عاصیہ' لکھنا چاہیے تھا جب کہ یہ بات چٹائی پر بیٹھا اور مانگ تانگ کر کھانے والا مدرسے کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے۔

خیر یہ ایک آدھ لطیف بات تو ہم نے اپنی تحریر میں شگفتگی پیدا کرنے کے لیے لکھ دی ہے ورنہ دل کی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی عدلیہ پر فخر ہے جس نے ایسے نابغۂ روزگار عدیم النظیر جج پیدا کیے ہیں۔ ملکۂ برطانیہ زندہ باد۔

اسلام اور پاکستان مدیر

چیف جسٹس آف پاکستان کی خدمت میں ایک پُرزور درخواست
چیئرمین نیب بھی توجہ فرمائیں

فرمایا وزیر اعظم پاکستان عمران خاں نے ۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء کو ٹرمپ کے جواب میں اپنے ایک پبلک بیان میں کہ:

ہم نے امریکہ کی جنگ میں:

- ۱۶,۴۸۲ ارب روپے کا نقصان اٹھایا
- ہمارے ۷۵,۰۰۰ افراد جان سے گئے۔
- ہم نے بری، بحری اور فضائی راستے امریکہ اور اس کے حلیفوں کو بلا معاوضہ دیے
- ہمارے قبائلی علاقے تباہ ہوئے اور لاکھوں افراد بے گھر ہوئے۔

جناب چیف جسٹس آف پاکستان!

آپ کی عدم گستری کے چرچے چارسُو ہیں۔ آپ چھوٹے چھوٹے مظالم میں بھی سُوموٹو ایکشن لیتے ہیں اور کسی بڑے پر ہاتھ ڈالتے بھی نہیں گھبراتے۔ ہماری آپ سے پُرزور درخواست ہے کہ جو لوگ ۷۵,۰۰۰ بے گناہ پاکستانیوں کو قتل کروانے کے اور ملک کو ۱۶,۴۸۲ ارب روپے کا نقصان پہنچانے کے ذمہ دار ہیں، آپ ان کے خلاف فوراً سُوموٹو ایکشن لیں، پاکستانی عوام کو انصاف دلوائیں اور مجرموں کو کیفر کردار کو پہنچائیں۔

ہم درخواست کرتے ہیں جناب چیئرمین نیب سے کہ آپ کرپشن فری پاکستان کے لیے بڑی تگ ودو کر رہے ہیں اور چند لاکھ کے مزعومہ فراڈ/ پبلک نقصان پر بڑے بڑے معزز لوگوں کو ہتھکڑیاں لگوا دیتے ہیں اور بڑے بڑے سیاستدانوں، وزیروں اور چیف منسٹروں کو جیل میں ڈلوا دیتے ہیں تو ایک مہربانی ہم پاکستانیوں کے ساتھ مزید یہ کریں کہ جن لوگوں نے ہمارا ۱۶,۴۸۲ ارب روپے کا نقصان کیا ہے، ان سب کو فوراً گرفتار کریں، جتنے پیسے ان سے اگلوانا ممکن ہوں وہ ان سے واپس لیں اور ان کو قرار واقعی سزا دیں۔

پاکستان میں توہینِ رسالت مدیر

افسوس ناک، شرمناک

ہماری دینی قوتوں کی ایک اور بڑی پسپائی

پتا نہیں اس ملک کی دینی سیاسی جماعتوں، اداروں اور اصلاحی تنظیموں کے قائدین کیا سوچتے ہیں اور کیسے سوچتے ہیں؟ ہمیں جو چیز نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری دینی قوتیں تیزی سے پسپا ہو رہی ہیں اور سیکولر، لبرل اور لادین قوتیں فرد، معاشرے اور ریاست پر غالب آتی جا رہی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہمارا آخری مورچہ اور ہمارا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ افسوس! ہم اس آخری مورچے کی حفاظت میں ناکام ہو رہے ہیں اور ہمارا یہ سب سے بڑا اثاثہ، ہماری آنکھوں دیکھتے، چور اور ڈاکو لوٹ لیے جا رہے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر پا رہے۔ پاکستان میں توہینِ رسالت کے پس منظر میں پہلے ہماری دینی قوتیں ممتاز قادری کی شہادت پر تحریک نہ چلا سکیں اور اب توہینِ رسالت کی مرتکب آسیہ مسیح کی رہائی کے خلاف بھی تحریک نہیں چلا سکیں۔

ہمارے دینی قائدین اور اسلامی دانشوروں کو اس پسپائی کے اسباب وعلل پر غور کرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ ہے عدم اخلاص اور فراست سے محرومی۔ دینی قائدین کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں، فرقہ واریت کا دور دورہ ہے۔ سیاسی اور مسلکی فائدے لوگوں کو محبوب تر ہیں، اختلاف وانتشار عام ہے۔ جب یہ لوگ دین کے لیے متحد ہونے کو تیار نہیں اور اپنے اپنے سیاسی اور مسلکی مفاد کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو ناکامی ہی ان کا مقدر ہونی چاہیے۔ منافقت کی انتہا یہ ہے کہ ’متحدہ مجلس عمل‘ بھی موجود ہے اور ’ملی یکجہتی کونسل‘ بھی اور ’اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ‘ بھی۔ یعنی نعرے ہر جگہ اتحاد کے ہیں اور عملاً اتحاد کہیں موجود نہیں۔

اور کوئی یہ بھی سوچنے کو تیار نہیں کہ اس منافقت کا حتمی نتیجہ ہے دنیا میں ذلت اور ناکامی اور آخرت میں اسفل السافلین کی رسوائی اور آگ کا عذاب۔ اے اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما! اے اللہ! ہمیں دنیا وآخرت کی ناکامی اور رسوائی سے بچنے کی توفیق عطا فرما!

پاکستان میں توہینِ رسالت

ڈاکٹر محمد امین [۱]

آسیہ مسیح کیس - ایک تجزیاتی مطالعہ

شرعی اور قانونی لحاظ سے یہ ایک کمزور اور غلط فیصلہ ہے جس کے حقیقی محرکات دوسرے ہیں

اس تجزیاتی مطالعے کے تین حصے ہیں:

۱۔ کیا فیصلہ میرٹ پر ہوا اور منصفانہ ہوا؟

۲۔ اگر نہیں تو اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟

۳۔ اب اس کی اصلاح کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

پہلا حصہ: کیا فیصلہ میرٹ پر ہوا اور منصفانہ ہوا؟

کوئی تصفیہ طلب معاملہ جب عدالت میں جاتا ہے تو عدالت کے سامنے دو فریق ہوتے ہیں، ایک مدعی اور دوسرا ملزم۔ مدعی نے یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ اس کا الزام سچا ہے اور مدعی نے دفاع کرنا ہوتا ہے کہ اس پر لگایا گیا الزام جھوٹا ہے۔ زیر بحث مقدمے میں معاملہ جب ضلعی عدالت میں گیا تو جج صاحب نے فیصلہ دیا کہ مدعی نے اپنا الزام واقعات اور گواہوں کے ذریعے ثابت کردیا ہے کہ ملزمہ نے توہین رسالت کی تھی جبکہ ملزمہ اپنے دفاع میں ان الزامات کو غلط اور اپنے موقف کو صحیح ثابت نہیں کرسکی کہ اس نے توہین رسالت کا جرم نہیں کیا لہٰذا وہ مجرمہ ہے اور مستحق سزا ہے۔ ہائی کورٹ میں جب اپیل کی گئی تو عدالت عالیہ نے ضلعی عدالت کے فیصلے کو جانچا اور اسے صحیح قرار دیا۔ لیکن جب یہ معاملہ سپریم کورٹ میں اپیل کے لیے گیا تو وہاں ججوں نے نچلی دونوں عدالتوں کے فیصلے کو غلط قرار دے دیا اور یہ کہا کہ مدعی اپنا الزام ثابت نہیں کرسکا اور ملزمہ سچی ہے اور اسے بری کردیا۔ آیئے! دیکھتے ہیں کہ عدالت عظمیٰ

---

[۱] ایم فل (فقہ واصول الفقہ۔ جامعہ الملک سعود، الریاض، سعودی عرب)
انگریزی قانون میں سرٹیفکیٹ (کیمبرج یونیورسٹی، برطانیہ)
اسلامی قانون میں ریسرچ پراجیکٹ (یونیورسٹی آف لندن، برطانیہ)
پی ایچ ڈی (علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور)

کے معزز جج اس فیصلے پر کیسے پہنچے؟

ملزمہ کے معاملے کو ہم پہلے لیتے ہیں کیونکہ وہ مختصر ہے اور مدعی کے بارے میں عدالتی تجزیے کو ہم اس کے بعد دیکھیں گے کہ وہ ذرا طوالت طلب ہے۔ ملزمہ کا موقف یہ ہے کہ:

- جن دو مسلمان عورتوں نے اس پر توہین رسالت کا الزام لگایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ان کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا اور انہیں اس ''جھگڑے اور سخت الفاظ کے تبادلے کی وجہ سے بے عزتی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔''

- شکایت کنندہ قاری سلام (گاؤں کا امام مسجد) بھی ''مقدمہ میں اپنا مفاد رکھتا ہے کیونکہ یہ دونوں خواتین اس کی زوجہ سے قرآن پڑھتی رہی ہیں'' لہٰذا گواہان (عورتوں) نے ''قاری سلام سے مل کر سازش کے تحت میرے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ گھڑا۔''

- استغاثہ کا گواہ ادریس [کھیت مالک] بھی ایسا گواہ ہے ''جو مقدمہ میں اپنا مفاد رکھتا ہے کیونکہ اس کا متذکرہ بالا خواتین سے قریبی تعلق ہے۔''

- ''پولیس بھی شکایت گزار سے ملی ہوئی تھی اس لیے پولیس نے مجھے اس مقدمے میں غلط طور پر پھنسایا''۔

یہ سب اقتباسات چیف جسٹس صاحب کے فیصلے کے پیرا ۲۸ سے لیے گئے ہیں۔

یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ملزمہ نے اپنا دفاع کرتے ہوئے گواہوں اور پولیس پر جو جوابی الزامات لگائے ہیں، انہیں ثابت کرنے کے لیے اس نے کوئی گواہ پیش نہیں کیا۔ حد یہ ہے کہ اس نے اس بارے میں دفعہ (2)340 کے تحت کوئی وضاحتی حلفیہ بیان بھی نہیں دیا (جیسا کہ دونوں جج تسلیم کرتے ہیں۔ دیکھیے چیف جسٹس کے فیصلے کا پیرا 20 اور جسٹس کھوسہ کے فیصلے کا پیرا 2) اور عقل عام اور معقولیت کی رو سے اس کے یہ الزامات غلط اور بے وزن لگتے ہیں کیونکہ اس کے بقول اگر اس کا مسلمان عورتوں سے جھگڑا ہوا تھا تو بے عزتی اس کی ہوئی تھی جس کے ہاتھ سے انہوں نے پانی پینے سے انکار کر دیا تھا نہ کہ مسلمان عورتوں کی۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ قاری سلام کا اس مقدمے میں کیا مفاد تھا اور اس نے کیوں گواہان سے مل کر ملزمہ کے خلاف سازش کی؟ اس کی یہ وجہ بالکل معقول نہیں لگتی کہ ان عورتوں

نے کبھی اس کی بیوی سے قرآن پڑھا تھا۔ کھیت مالک کے بارے میں ملزمہ نے کہا کہ اس کا بھی اس مقدمہ میں مفاد تھا کیونکہ اس کا گواہی دینے والی خواتین سے قریبی تعلق ہے۔ لیکن وہ یہ بتانے میں ناکام رہی کہ اس کا اس مقدمے میں کیا مفاد ہے؟ اور اس کا ان خواتین سے کیا تعلق ہے؟ آیا وہ اس کی رشتہ دار ہیں، ہمسائی ہیں یا اس کی برادری کی ہیں؟ محض آجر اور اجیر کا تعلق ہونا اس کے مفاد اور قریبی تعلق کو ظاہر نہیں کرتا کیونکہ اس کا یہ تعلق تو ملزمہ سے بھی تھا۔

اس طرح محض اپنے چلتے ہوئے تبصرے سے گواہان کو ردّ کرنے کے بعد ملزمہ پولیس کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ بھی شکایت گزار سے ملی ہوئی تھی اور اس نے مجھے مقدمہ میں غلط طور پر پھنسایا، لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ پولیس شکایت کنندہ سے کیوں ملی ہوئی تھی اور اس نے کیوں اسے اس غلط مقدمے میں پھنسایا؟ نہ اس نے پولیس پر رشوت لینے کا الزام لگایا اور نہ گاؤں کے پیش امام اور کھیت مزدور عورتوں کی مالی حالت ایسی متصور ہوسکتی ہے کہ وہ پولیس کو رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیتے۔

غرض ملزمہ اپنا دفاع کرنے میں ناکام رہی اور اس نے محض جوابی الزامات لگانے پر اکتفا کیا لیکن اس کے جوابی الزامات میں کوئی صداقت اور وزن نظر نہیں آتا اور نہ اس نے انہیں ثابت کرنے کی کوئی کوشش کی لیکن معزز ججوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ ان کا رویہ اس کے ساتھ ہمدردانہ ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔

اب آیئے استغاثہ کی طرف۔ استغاثہ کے گواہان کے بیانات کے تفصیلی تجزیے کے بعد معزز ججوں نے انہیں غلط اور جھوٹ پر مبنی قرار دیا۔ وہ اس نتیجے پر کیسے پہنچے اور اس میں ان کا منہج اور طریق کار کیا تھا؟ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اجمال کی تفصیل کو تضاد قرار دینا

شکایت کنندہ نے اپنے اور گواہوں کے بارے میں جو موقف FIR میں مجمل بیان کیا تھا، اس کی تفصیلات فریق مخالف کے وکیل نے جرح کے دوران طرح طرح کے سوالات کرکے پوچھیں۔ گواہوں کے ان جوابات کو عدالت نے تضاد بلکہ Material Contradiction قرار دیا ہے حالانکہ وہ اجمال کی تفصیل تھی، مزید معلومات تھیں اور

گواہوں کے بیان اور مدعا کا تسلسل تھیں، اس سے متضاد نہ تھیں۔مثلاً FIR میں شکایت کنندہ قاری سلام نے بتایا کہ گواہان عورتوں نے اسے ملزمہ کی توہین رسالت کے بارے میں بتایا۔ جرح میں دفاع کے وکیل کے سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ عورتیں اس کی بیوی سے قرآن پڑھتی رہی تھیں لہٰذا اس کی بیوی کے پاس آئیں۔ اس طرح اسے اس واقعے کی خبر ہوئی اور اس وقت اس کے پاس فلاں فلاں صاحب بھی موجود تھے۔اب یہ تفصیل اس کے بنیادی موقف سے متضاد نہیں بلکہ اس کی مزید وضاحت ہے۔FIR میں اس کا موقف اجمالی تھا، جرح میں اس کی تفصیلات سامنے آ گئیں۔ اسے تضاد کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

۲۔تفصیلات کے اختلاف کو وقوعہ کے انکار کا سبب بنانا

کسی وقوعہ کے بارے میں تفصیلات کے حوالے سے گواہان میں اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن ان اختلافات سے وقوعہ کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا مثلاً پنچایت کا اجتماع کس وقت ہوا؟ کس جگہ ہوا اور اس میں کتنے لوگ تھے؟ اس بارے میں گواہوں میں اختلاف بلاشبہ موجود ہے لیکن کیا ان اختلافات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پنچایت کا اجتماع ہوا ہی نہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ خود چیف جسٹس صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ پنچایت کا اجتماع ہوا (پیرا24) تو اختلاف کو ابھارنے اور نمایاں کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اور اسے تضاد کہہ کر رد کرنا چہ معنی دارد؟

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ چیف جسٹس صاحب کہتے ہیں کہ شکایت کنندہ کے بیانات میں اختلاف ہے کہ وقوعہ کے بارے میں اطلاع دو عورتوں نے اسے کب دی؟ کیونکہ اس بارے میں FIR اور جرح کی تفصیلات میں اختلاف ہے۔ وہ اسے تضاد کہہ کر رد کر دیتے ہیں (پیرا32) سوال یہ ہے کہ اس اختلاف سے چیف جسٹس کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ کیا یہ کہ گواہان نے شکایت کنندہ کو مطلع کیا ہی نہیں؟ ظاہر ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ خود ملزمہ تسلیم کرتی ہے کہ معافیہ، اسماء اور یاسمین نے جا کر قاری سلام کو اطلاع دی تھی (پیرا28) بلکہ اس پر اصرار مضحکہ خیز ہو سکتا ہے مثلاً پولیس کے بیانات میں اس امر میں اختلاف موجود ہے کہ ملزمہ کو پولیس نے کب گرفتار کیا؟ چیف جسٹس صاحب کہتے ہیں کہ یہ تضاد ہے۔سوال یہ ہے کہ اس مصنوعی تضاد کو ابھارنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پولیس نے مجرمہ کو گرفتار ہی نہیں کیا؟ حالانکہ وہ پچھلے نو (۹) سال سے جیل میں ہے۔تو ان اختلافات کو نمایاں

کرنا اور انہیں متضاد قرار دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور دنیا کے کس قانون اور اصول کی رو سے اس سے اصل وقوعے کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے؟

۳۔ معقول توجیہ کو قبول نہ کرنا اور اسے منفی رنگ دینا

چیف جسٹس صاحب کہتے ہیں کہ کھیت میں پچیس تیس عورتیں کام کر رہی تھیں تو توہین رسالت کا الزام صرف دو عورتوں نے کیوں لگایا؟ یہ بات شک کو جنم دیتی ہے۔ دیکھیے! اگر زمینی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ کھیت میں بلاشبہ پچیس تیس عورتیں کام کر رہی تھیں لیکن کھیت میں کیاریاں یا پَیلیاں بنی ہوتی ہیں۔ ہر کیاری یا پَیلی میں چار پانچ عورتیں فالسے چن رہی تھیں، جس کیاری یا پَیلی میں جھگڑا ہوا وہاں آسیہ مسیح کے ساتھ تین مسلمان عورتیں تھیں۔ معافیہ، اسماء اور یاسمین۔ معافیہ اور اسماء دونوں بہنیں ہیں ان کے ساتھ آسیہ کی تو تکار ہوئی جس کے نتیجے میں آسیہ نے اہانت رسول کی۔ یاسمین بھی سن رہی تھی (لیکن اس نے عدالت میں جا کر گواہی نہیں دی کہ اس کے گھر والوں نے اجازت نہیں دی ہوگی کہ بہت سے لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کی بہو بیٹیاں برسوں عدالتوں میں دھکے کھاتی رہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے اردو ترجمے میں اسے 'منحرف گواہ' قرار دیا گیا ہے جو غلط ہے، وہ منحرف گواہ نہیں تھی بلکہ متروک (Given up) گواہ تھی یعنی وہ گواہی دینے کے لیے عدالت آئی ہی نہیں) ان کی تو تکار کو سن کر دوسری عورتیں بھی وہاں آ گئیں تو انہیں جھگڑے کی وجہ کا پتہ چلا۔ اس سے ظاہر ہے کہ توہین رسالت کا ارتکاب صرف تین عورتوں کے سامنے ہوا جن میں سے دو نے گواہی دی۔ باقی پچیس تیس عورتیں تو شور سن کر آئیں، انہوں نے آسیہ کے الفاظ سنے ہی نہیں تو وہ توہین رسالت کی گواہی کیسے دیتیں؟ لہٰذا اس بات کو اچھالنا کہ پچیس تیس عورتوں نے گواہی نہیں دی اور صرف دو نے گواہی دی لہٰذا ان کی بات مشکوک ہے، یہ مؤقف یا تو لاعلمی کی بنیاد پر اپنایا جا سکتا ہے یا بدنیتی کی بناء پر۔

اس کی ایک اور واضح مثال FIR تاخیر سے دائر کرنے کی ہے۔ شکایت کنندہ نے تاخیر کی وجوہات بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اتنے حساس معاملے کو خواہ مخواہ اچھالنے اور اسے عدالت لے جانے سے بچنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے اپنی تسلی کرنا چاہی کہ وقوعہ ہوا بھی ہے یا نہیں؟ لہٰذا اس

نے پوچھ گچھ کی، سوچا، پنچایت کا انتظام کیا اور جب آسیہ نے وہاں سیکڑوں لوگوں کے سامنے اعتراف جرم کیا تو پھر ہی اس نے FIR کٹوائی۔ چیف جسٹس نے اس عذر کو تسلیم کیا لیکن اس کے باوجود چیف جسٹس اور جسٹس کھوسہ نے FIR تاخیر سے کٹوانے کو آسیہ کے حق میں فیصلہ کرنے اور استغاثہ کا موقف مشکوک قرار دینے کا سبب قرار دیا۔ (چیف جسٹس پیرا29، جسٹس کھوسہ پیرا4)۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جج صاحبان کہتے ہیں کہ بنیادی گواہوں کے بیان میں تضاد ہے کیونکہ معافیہ اور اسماء نے کہا کہ ان کا جھگڑا نہیں ہوا جبکہ کھیت مالک اور پولیس ایس پی کہہ رہا ہے کہ ان میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس حوالے سے جو اقتباسات چیف صاحب نے گواہوں کے دیے ہیں (پیرا ۴۷) اس میں ہے کہ معافیہ نے کہا کہ میرے آسیہ کو توہین رسالت کا مرتکب قرار دینے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا یا یہ کہ میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اور اسماء نے کہا کہ میرا اس سے جھگڑا نہیں ہوا کہ اس کی وجہ سے میں نے اس پر توہین رسالت کا لزام لگایا ہو یا یہ کہ میں نے کانوں سے نہیں سنا اور اس پر جھوٹا الزام لگا رہی ہوں۔

یہاں بات یہ ہو رہی ہے کہ آسیہ مسیح کے توہین رسالت کے الفاظ کہنے کا محرک کیا تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ محرک کا ہونا یا نہ ہونا کسی واقعہ کے وجود پذیر ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ صرف اس کی تفہیم میں مدد دیتا ہے۔ مثلاً ایک قتل ہو گیا، اب اگر اس کے محرک کا پتہ چل جاتا ہے تو بہت خوب لیکن اگر اس کے محرک کا پتہ نہ بھی چلے تو ظاہر ہے قتل تو ہو گیا، اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب جسٹس کھوسہ صاحب باصرار کہتے ہیں کہ آسیہ کی اور اس کے مذہب کی توہین ہوئی تو پھر اس نے جواب میں کچھ کہا (پیرا9) تو گویا وہ بالواسطہ طور پر تسلیم کر رہے ہیں کہ آسیہ کے مذہب کی توہین ہوئی تو اس نے بھی جواباً مسلمان عورتوں کے رسول کی توہین کی۔ یہ تو گویا آسیہ کو مجرم تسلیم کرنے کی بات ہے..... جب کہ عملاً آپ نے اسے بری کر دیا ہے۔

اگر معافیہ اور اسماء کو استغاثہ کے وکیل نے یہ پٹی پڑھائی کہ تم عدالت میں جھگڑے سے انکار کر دینا تو یہ اس کی حماقت تھی کیونکہ ملزمہ اور عافیہ و اسماء میں تو تکار کا ہونا وقوعہ کے ہونے کا جواز بنتا۔ رہا آسیہ کا یہ الزام کہ ان دونوں کی بے عزتی ہوئی اور رنج میں انہوں نے اس پر توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگا دیا تو اس غیر معقول بات کو کوئی بھی تسلیم نہ کرتا۔ اسی طرح یہ بھی

استغاثہ کی حماقت تھی کہ اس نے پنچایت کے اجتماع میں آسیہ کے اقرارِ گناہ کا صرف ایک گواہ پیش کیا۔ اگر وہ پچاس یا سو گواہ پیش کرتا (جو اسے یقیناً مل جاتے) تو اس 'تواتر' کی موجودگی میں کوئی جج آسیہ کے حق میں فیصلہ کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا۔

۴۔ ماورائے عدالت اقرار بے وزن ہوتا ہے

اگر ملزم عدالت کے سامنے اقرار جرم کرلے تو مسئلہ ہی ختم ہوگیا لیکن اگر ملزم عدالت کے باہر اقرار کرے اور عدالت کے سامنے اسے تسلیم نہ کرے تو پھر عدالت کو دیکھنا ہوتا ہے کہ اس کے ماورائے عدالت اقرار کو استغاثہ ٹھوس واقعات وشواہد سے ثابت کرتا ہے یا نہیں؟ یا ملزم اپنے موقف کو واقعات وشواہد سے سچا ثابت کرتا ہے یا نہیں؟ مقدمہ زیر بحث میں استغاثہ میں چار فریق ہیں: وہ دو عورتیں جن کے سامنے ملزمہ نے توہین رسالت کی۔ مالک کھیت جس کے سامنے آسیہ نے جرم تسلیم کیا۔ مجمع عام جس کے سامنے اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا اور چوتھے نمبر پر پولیس آفیسرز جو حکومت کے ملازم ہیں اور غیر جانبدار ہیں۔ ان سب نے گواہی دی کہ ملزمہ نے بغیر کسی اکراہ اور جبر کے اقرارِ جرم کیا۔ سوال یہ ہے کہ ان سات گواہوں کی گواہی کو کیوں رد کیا جائے اور اکیلی ملزمہ کی بات کو کیوں سچ سمجھ لیا جائے جس نے نہ حلفیہ بیان دیا، نہ اپنے حق میں کوئی گواہ پیش کیا اور نہ ہی الزام لگانے والوں کے موقف کے خلاف کوئی ٹھوس دفاع پیش کرسکی؟

خلاصۂ بحث

مندرجہ بالا تجزیے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آسیہ مسیح نے توہین رسالت کی تھی اور استغاثہ اسے ثابت کرنے میں کامیاب رہا لیکن جج حضرات نے وہ چار طریقے اختیار کرکے جو ہم نے سطور بالا میں لکھے ہیں، استغاثہ کی گواہیوں کو حیلے بہانے ردّ کرکے اور گواہوں کو جھوٹا قرار دے کر استغاثہ کے کیس کو کمزور ثابت کیا اور اس طرح مصنوعی طور پر ملزمہ کے کیس کو آکسیجن مہیا کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ججز نے فیصلہ میرٹ پر نہیں کیا اور ان کا رویہ جانبدارانہ ہے بلکہ ملزمہ کے ساتھ ہمدردی اور جانب داری کا ہے۔ اس کے قرائن یہ ہیں کہ ملزمہ نے اپیل متعینہ وقت گزر جانے کے گیارہ دن بعد دائر کی لیکن چیف جسٹس نے اسے قبول

کرلیا۔ اس نے مجمع کے سامنے اقبال جرم کیا اور معافی مانگی لیکن چیف جسٹس اس کی وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجمع خونخوار اور مائل بہ تشدد تھا۔ وہ بیچاری اکیلی عورت خوفزدہ اور ہراساں ہوگئی اور ڈر کے مارے جرم قبول کرلیا لہٰذا اس اقبال جرم کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور جسٹس کھوسہ صاحب تو کہتے ہیں کہ ملزمہ کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوا کہ مسلمان عورتوں نے اس کی اور اس کے مذہب کی توہین کی تو وہ جواب دینے پر مجبور ہوگئی....اس طرح ججوں نے استغاثہ کے گواہوں میں خامیاں تلاش کر کے ملزمہ کو سچا ثابت کیا اور اسے بری کردیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ججوں کے اس فیصلے کے حقیقی محرکات قانونی نہیں تھے، دوسرے تھے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ آسیہ مسیح کیس کا فیصلہ نہ تو میرٹ پر ہوا ہے اور نہ یہ غیر جانب دارانہ ہے بلکہ قانونی لحاظ سے یہ نہایت کمزور اور شرعی لحاظ سے بالکل غلط فیصلہ ہے۔ ججوں نے ایک خاص جہت سے حالات کو دیکھا اور فیصلہ سنادیا حالانکہ اسی مواد کو کئی دوسری جہتوں سے دیکھا جاسکتا تھا اور موجودہ فیصلے کے برعکس فیصلہ بآسانی دیا جاسکتا تھا۔ خصوصاً اگر عدالت استغاثہ کی گواہیوں سے پورے طور پر مطمئن نہیں تھی تو اس کے سامنے کئی راستے کھلے تھے:

۱۔ وہ کیس نچلی عدالت کو ریمانڈ کردیتی اور نقائص کی نشان دہی کر کے اسے مزید تفحص و تنقیح کا حکم دیتی۔

۲۔ وہ دریافت حقائق کے لیے جے آئی ٹی (JIT) بنادیتی۔

۳۔ وہ ملزمہ کو تعزیراً کچھ سزا دے دیتی جس کا جواز واضح طور پر موجود تھا کہ اس کا طرز عمل فتنہ اور فساد فی الارض کا سبب بنا۔ اس کی وجہ سے وفاقی وزیر شاہباز بھٹی قتل ہوا، گورنر پنجاب سلمان تاثیر قتل ہوا۔ اسے قتل کرنے والا ممتاز قادری (شہید) پھانسی چڑھا۔ ملک بھر میں ہنگامے ہوئے، امن و امان کی صورتِ حال بگڑی، سپریم کورٹ کا ایک جج مستعفی ہوا اور اس سب کے ردعمل میں انتہا پسند مذہبی تنظیمیں ابھریں۔ لہٰذا اگر عدالت اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ مقدمے کی بنیادی گواہ دو عورتیں ہیں اور دوسری گواہیاں معیاری نہیں تو وہ مجرمہ کو حد کی سزا نہ دیتی تعزیراً سزا دے دیتی۔ ہمارے ججوں نے چونکہ شرعی قانون نہیں پڑھا لہٰذا وہ شریعت یا اسلامی قانون (فقہ و اصول فقہ) کی اصطلاحات استعمال نہیں کرتے لیکن جو لوگ شرعی قانون سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی مقدمے میں حد ثابت نہ ہو تو بھی قاضی تعزیراً سزا

دے سکتا ہے جو قتل، حبس (عمر قید یا کچھ سالوں کی قید) یا جرمانہ ہوسکتی ہے۔

لیکن فیصلہ پڑھنے کے بعد ججوں کا ذہن یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ قانونی نکات سے قطع نظر، دیگر محرکات کی بناء پر ملزمہ کو ہر قیمت پر بری کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے گواہیوں کو ساقط الاعتبار قرار دینے کے لیے قانونی باریکیاں چھانٹیں، ایسی اصطلاحات استعمال کیں (جیسے گواہوں کے تفصیلی بیان کو اضافی معلومات کی بجائے 'تضادات' قرار دینا حالانکہ وہ تضادات نہیں ہیں) اور حالات کا ایسا نقشہ کھینچا جس سے انہیں گواہوں کو جھوٹا قرار دینے اور گواہیوں کو کلیتاً رد کرنے اور ملزمہ کو رہا کرنے کا موقعہ مل گیا بلکہ جسٹس کھوسہ صاحب تو ملزمہ کو مظلومہ قرار دیتے ہیں کہ اس کی اور اس کے مذہب کی توہین ہوئی۔ اور کوئی بعید نہیں کہ کل کلاں جب گرد بیٹھ جائے تو کوئی سیکولر وکیل آسیہ کیس کے گواہوں کو ان کے جھوٹ کی سزا دلوانے اور معافیہ و اسماء کو آسیہ کے مذہب کی توہین کرنے کے 'جرم' میں سزا دلوانے کے لیے عدالت پہنچ جائے اور ججوں کے ان ریمارکس کی وجہ سے جو انہوں نے اس کیس میں دیے ہیں، انہیں باقاعدہ سزا مل جائے۔

حصہ دوم: فیصلہ میرٹ پر نہ کیے جانے کے اسباب و محرکات

کوئی تہذیب، معاشرہ، ملک، ملکی ادارے اور فرد فضا میں رہ کر کام نہیں کرتا اور نہ ہوا بند خانوں (Air tight compartments) میں زندہ رہ سکتا ہے بلکہ دوسری تہذیبوں خصوصاً دنیا میں غالب تہذیب کے افکار، علمی منہاج اور تہذیبی رویے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دین، فکر اور تہذیب کی برتری اور میرٹ کی اساس پر معلوم دنیا کے ایک بڑے حصے پر بارہ سو سال تک حکومت کی لیکن پھر ایک وقت آیا کہ وہ زوال پذیر ہوئے اور حریف مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک سے شکست کھا گئے۔ ڈیڑھ دو صدیاں غلامی میں گزارنے کے بعد اب وہ خواب غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں بلکہ اکثر ممالک کو بظاہر مغربی استعمار سے آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے لیکن اس کے باوجود مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کے مسلمانوں اور ان کے اداروں (خصوصاً عدلیہ، جو اس وقت زیر بحث ہے) پر ان کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صلیب

وہلال کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔ مغربی استعمار ہر قیمت پر مسلمانوں کو زیر دست، پسماندہ اور غلام رکھنا چاہتا ہے جب کہ مسلمان مغربی فکر وتہذیب کی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اس عظمتِ گم گشتہ کے خواب دیکھتے ہیں جس نے انہیں چودہ سو سال پہلے عروج سے ہم کنار کیا تھا۔ مغرب کا جدید استعمار آج اکیسویں صدی کے 'مہذب'، 'جمہوری' اور 'ترقی یافتہ' دور میں بھی مسلمانوں کو ہر لحاظ سے پاؤں کے نیچے رکھنا چاہتا ہے اور جب کچھ مسلمان ممالک اس کے باوجود سر اٹھانے اور اسلام کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ میڈیا کی پراپیگنڈا جنگ اور اپنی مہیب، مہلک اور جدید ترین جنگی مشینری سے ان مسلمان ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ عراق، افغانستان اور لیبیا تباہ کیے جا چکے، یمن اور شام جل رہے ہیں اور پاکستان و ایران پر دباؤ جاری ہے۔ ان حالات میں عالم اسلام پر اور خصوصاً پاکستان اور اس کے اداروں پر مغربی دباؤ کے جو اثرات ہیں، ان کا انکار ایسے ہی ہے جیسے دن کی روشنی میں سورج کے وجود کا انکار کر دیا جائے۔ توہین رسالت کے حوالے سے مسلم معاشرے پر ان اثرات کی مزید تفہیم کے لیے ہم انہیں بلاواسطہ اور بالواسطہ دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مسلم معاشرے پر مغرب کے بلاواسطہ اثرات

بلاواسطہ اثرات سے ہماری مراد وہ اثرات ہیں جو مغربی قوموں کے علانیہ اور براہ راست اقدامات کا نتیجہ ہیں جیسے مغربی قوتوں نے 'بنیادی انسانی حقوق' کا چارٹر اور عورتوں کے حقوق کے لیے قاہرہ کانفرنس، بیجنگ پلس کانفرنس وغیرہ سے ایسے اصول اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے منظور کرا رکھے ہیں جن میں غیر اسلامی شقیں شامل ہیں۔ اسی طرح اکثر مغربی ممالک نے سزائے موت ختم کر رکھی ہے اور وہ پاکستان سے بھی اس کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں جن سے قصاص اور حدود کے اسلامی قوانین کی نفی ہوتی ہے۔ نیز مغرب علی الاعلان توہین رسالت اور توہین قرآن وغیرہ کے اسلامی قوانین کو آزادیٔ اظہار رائے کے خلاف قرار دے کر انہیں ختم کرنے کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ توہین رسالت کو جدید مغربی استعمار اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک حربے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ ان کے تھنک ٹینک مسلمانوں کے دل میں محبت رسول کو برائی اور تعصب کی جڑ سمجھتے ہیں۔ سابق امریکی صدر اوباما نے ۲۰۱۶ء میں جنرل اسمبلی

کے اجلاس میں علی الاعلان آزادیٔ اظہار رائے کے حق کو توہین رسالت کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دیا تھا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مغرب توہین رسالت اور توہین اسلام کے حوالے سے کتابیں، رسالے اور کارٹون چھاپتے، فلمیں بناتے اور قرآن جلاتے ہیں۔ وہ اپنی ان حرکتوں کی تکرار سے یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر اپنے نبی کی محبت کے حوالے سے جو حساسیت پائی جاتی ہے وہ بتدریج ختم ہو جائے نیز وہ ان کو مشتعل کر کے ان کے جذباتی ردّعمل سے لطف اندوز ہوتے اور ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اسی کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم یا فکری طور پر ان کے ہتھے چڑھا ہوا کوئی بد بخت مسلمان، توہین رسالت کا مرتکب ہو جائے تو وہ اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں اور کمزور مسلمان حکومتوں پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ ان کو رہا کر دے یا اگر کوئی باحمیت مسلمان ایسے کسی بد بخت مسلمان شاتم کو قتل کر دے تو مسلمان حکومتوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اسے جلد سے جلد سخت ترین سزا دی جائے جیسا کہ پہلے ممتاز قادری کو پھانسی چڑھانے میں جلدی کی گئی اور اب آسیہ مسیح کو بری کرنے میں جلدی برتی گئی ہے۔ حالانکہ توہین رسالت کے کئی مرتکبین برسوں سے جیلوں میں پڑے ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔

ان حالات میں کمزور مسلمان حکومتوں کا اور ان کی فوج کا جو ملک چلانے کے لیے اہل مغرب سے قرض لینے اور ان کا اسلحہ خریدنے پر مجبور ہیں، ان کا اور ان کی وجہ سے عدلیہ کا مغرب کے غیر مری دباؤ میں آنا ناگزیر ہے اور ایسے حالات میں یہ سوچنا کہ توہین رسالت کے کیسوں میں اعلیٰ عدلیہ کے جج میرٹ پر اور غیر جانبدارانہ فیصلے کرتے ہیں سادہ لوحی اور حماقت ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جج بیچارے Face Saving کے لیے یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے میرٹ پر فیصلہ کیا ہے اور وہ اپنی قانونی مہارت استعمال کر کے فیصلے اس انداز میں لکھتے ہیں کہ وہ صحیح اور باوزن محسوس ہوں۔ پہلے ممتاز قادری کیس میں اور اب آسیہ مسیح کیس میں ایسا ہی ہوا ہے۔ جنوری ۲۰۱۸ء میں یورپی یونین کا وفد آیا تھا جس نے آسیہ مسیح کی جلد رہائی کا مطالبہ کیا تھا اور بالواسطہ طور پر GSP پلس کی تجدید کو اس سے مشروط کیا تھا (بزنس ریکارڈر ۲۲ جنوری ۲۰۱۸ء)۔ برطانیہ کی ''برٹش ایشین کرسچن ایسوسی ایشن'' نے آسیہ کی رہائی کے لیے تحریک چلائی۔ اسلام مخالف سیکولر اور لبرل عناصر نے سوشل میڈیا اور خصوصاً فیس بک پر خوب دہائی

مچائی۔ پوپ ویٹیکن نے آسیہ کی رہائی کے لیے دعائیہ تقریب منعقد کی۔ غیر ملکی پادریوں اور وکلاء کے ایک گروپ نے اس غرض سے وزیر اعظم عمران خاں سے ملاقات کی۔ چیف جسٹس نے آسیہ کا کیس لگنے سے پہلے اس کے وکیل کو کہا کہ تیاری کرلیں آپ کا کیس لگنے والا ہے۔ یہ ساری باتیں آن دی ریکارڈ ہیں اور ان کے اخباری تراشے اور وڈیو کلپ موجود ہیں۔ مولانا سمیع الحق شہید کا وڈیو کلپ بھی موجود ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے عمران خان سے کہا تھا کہ وہ بیرونی دباؤ قبول نہ کرے اور اس معاملے میں تذبذب کا شکار نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آسیہ مسیح کا فیصلہ مغربی دباؤ کا نتیجہ ہے اور اسے مبنی بر میرٹ کہنا مشکل ہے۔

مسلمانوں پر مغرب کے بالواسطہ اثرات

مغربی استعمار نے جب مسلمان ملکوں پر قبضہ کیا تو اس نے ان کے سیاسی، تعلیمی، قانونی، مالی.... نظام اور اجتماعی ڈھانچے کو منہدم کر کے از سرنو اپنی فکر و تہذیب کے مطابق ان کی تشکیل نو کی خصوصاً اس نے مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کو بدلا تا کہ وہ ان کی ذہنی تطہیر کر کے ان کو فکری طور پر اپنا مستقل غلام بنا سکے چنانچہ اس میں اسے کامیابی ہوئی۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اسے مسلمان ملکوں کو آزادی دینا پڑی تو اس نے پلاننگ سے اقتدار ان طبقوں کو منتقل کیا جو اس کے حامی اور پروردہ تھے۔ اس کی تیار کردہ بیوروکریسی، فوج، پولیس اور عدلیہ نے بھی نوآزاد ممالک میں مغرب کی فکری اور تہذیبی بالادستی کو یقینی بنانے میں اس کا ساتھ دیا۔

برصغیر میں انگریز کے قبضے سے پہلے مسلمانوں کا نظام تعلیم علماء کرام کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ نظام تعلیم ملک کے نظام قضا کو چلانے کے لیے ایسے قاضی تیار کرتا تھا جو شریعت کے مطابق نظام قضا چلاتے تھے اور انہیں فقہاء اور مفتیوں کا تعاون بھی حاصل ہوتا تھا۔ انگریز نے آکر وہ نظام تعلیم ختم کردیا۔ عربی و فارسی کی جگہ انگریزی زبان لائی گئی اور شرعی قوانین کی جگہ انگریزی قانون کو دے دی گئی۔ لاء کالجوں میں تعلیم انگریزی قانون کی شروع ہوگئی اور کھاتے پیتے لوگ بیرسٹر بننے کے لیے اور انگریزی قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ جانے لگے۔ یوں وکلاء اور ججوں کا وہ طبقہ وجود میں آیا جو آج ہمارا عدالتی اور قانونی نظام چلا رہا ہے۔ نہ انہیں شریعت کا قانون پڑھایا جاتا ہے، نہ وہ عربی جانتے ہیں اور نہ ان کی اسلامی تربیت ہوتی ہے۔

جدید تعلیم کا عمومی نظام ہمارے ہاں مغرب زدہ اور موثر اسلامی نصاب سے محروم ہے اور اسلامی اصول واقدار شخصیت کا حصہ ہی نہیں بن پاتے۔ ان ججوں اور وکیلوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلام کے مطابق فیصلے کریں گے اور کرائیں گے، جَو بو کر گندم کاٹنے کی توقع کرنا ہے لہٰذا یہ عبث ہے اور خوش فہمی پر مبنی ہے بلکہ حماقت ہے۔ ہاں! ذاتی طور پر کسی جج یا وکیل نے قرآن وسنت، عربی زبان اور فقہ واصول فقہ کا مطالعہ کر رکھا ہو تو وہ ایک استثنائی معاملہ ہے جو شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس صورت حال کے منطقی طور پر کئی تباہ کن نتائج نکلے ہیں:

۱۔ ہمارے وکلاء اور ججوں کی بہت بڑی اکثریت شرعی قانون سے ناواقف ہے لیکن چونکہ وہ مسلمان ہیں لہٰذا قرآن وسنت کا ایک آدھ حوالہ دے کر وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے فیصلے قرآن وسنت کے مطابق ہیں حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ زیر بحث کیس میں چیف جسٹس نے کلمۂ شہادت کا ترجمہ غلط کیا ہے اور جسٹس کھوسہ نے لفظ آسیہ کے معنی غلط لکھے ہیں۔ عام ججوں کا تو کیا ذکر ماضیٔ قریب کے اسلام آباد ہائی کورٹ کے جسٹس شوکت عزیز صدیقی (جو اپنی اسلامیت کے لیے معروف اور سیکولرسٹوں کے ہاں اسی وجہ سے 'بدنام' تھے اور اسی لیے نوکری سے نکالے گئے) انہوں نے ممتاز قادری شہید کے خلاف فیصلہ دیا اور تاویل در تاویل کر کے قرآن وسنت کی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ دیا۔

۲۔ جدید تعلیم اور قانون کی تعلیم کے مغرب زدہ اور اسلام پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے اور جس طرح کے ماحول میں وکلاء اور ججز عملی زندگی میں کام کرتے ہیں، اس کے پیش نظر ہمارے وکلاء اور ججوں کا جو مائنڈ سیٹ بنتا ہے وہ ۹۰، ۹۵ فیصد سیکولر اور لبرل مائنڈ سیٹ ہوتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں لیکن حقیقی اسلامی مائنڈ سیٹ ان کے لیے نامانوس اور اجنبی ہوتا ہے اور اسے وہ ملّائیت، جہالت اور جذباتیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بات ہماری اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں سے بالکل عیاں ہے۔ منیر انکوائری رپورٹ میں جسٹس منیر نے علماء کا مضحکہ اڑایا۔ جنرل ضیاء الحق نے ہمت کر کے قرارداد مقاصد کو آئین کا باقاعدہ حصہ بنایا لیکن ہماری عدالت عظمیٰ نے اسے باقی آئین پر حاوی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آئین کی وہ شقیں جو مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ہیں حکمرانوں کی ضرورت ہوتی ہیں لہٰذا ان پر عدالت عظمیٰ زور وشور سے عمل درآمد کراتی ہے،

سوموٹو ایکشن لیتی ہے لیکن دستور کی اسلامی دفعات پر کوئی عمل نہیں کرتا اور کراتا۔(حدود قوانین ۱۹۷۹ء سے نافذ ہیں۔کیا آج تک کسی چور کا ہاتھ کٹا ہے؟ کسی زانی کو کوڑے لگے ہیں؟) عدالت عظمیٰ نے چند سال پہلے آئین کے ان متفق علیہ پہلوؤں کا ذکر کیا تھا جنہیں پارلیمنٹ نہیں بدل سکتی اور اس میں جمہوریت، بنیادی انسانی حقوق، عدلیہ کی آزادی وغیرہ کو شامل کیا تھا لیکن اس میں دستور کی اسلامی حیثیت کو شامل نہیں کیا۔ممتاز قادری کیس میں ہماری اعلیٰ عدلیہ نے جو فیصلہ کیا وہ اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ کا سیاہ ترین فیصلہ ہے کیونکہ ایسا فیصلہ آج تک کسی مسلمان ملک میں کسی مسلمان قاضی نے آج تک نہیں دیا۔اور یہی حال آسیہ مسیح کیس کے فیصلے کا ہے اور اسی لیے سوائے تھوڑے سے مغرب زدہ افراد اور طبقوں کے پاکستانی مسلمانوں کی عظیم اکثریت ان فیصلوں کو ناپسند اور رد کرتی ہے۔وہ ممتاز قادری کو شہید کہتی ہے اور آسیہ کو عاصیہ ملعونہ سمجھتی ہے، عدالت خواہ کچھ بھی فیصلہ کرتی رہے۔

۳۔ ہمارا دستور قرآن وسنت کی برتری کو تسلیم کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیمات کی ہر بات دستور میں لکھی ہوئی نہیں ہوسکتی لہٰذا جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آتا ہے جہاں جدید مغربی قانون اور اسلامی قانون میں تضاد ہو یا اسلامی قانون کا ذکر دستور میں نہ ہو تو ہمارے جج شرعی قانون سے عدم واقفیت کی بناء پر اور اپنے سیکولر اور لبرل مائنڈ سیٹ کی وجہ سے اسلامی قانون کے خلاف فیصلے کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ مسلمان ہیں لہٰذا نیے فیصلوں کو اسلامی قرار دینے پر مصر ہیں۔اس کی معروف مثال ممتاز قادری کیس ہے۔اب اسلامی قانون یہ ہے، جو متعدد صحیح احادیث پر مبنی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے اور مسلمانوں کے ہاں چودہ سوسال سے مروج ہے کہ اگر کوئی باحمیت مسلمان توہین رسالت کی بنیاد پر اشتعال میں آکر کسی مسلم یا غیر مسلم شاتم کو قتل کردے تو عدالت یہ دیکھے گی کہ کیا اس نے قتل توہین رسالت کی بنیاد پر کیا یا کسی دوسری غرض سے؟ اگر اس کا محرک توہین رسالت ہو تو عدالت اسے بری کردے گی لیکن اگر اس نے قتل کسی اور محرک کے تحت کیا ہو تو عدالت قصاص میں اس کے قتل کا حکم دے گی۔لیکن ہماری اعلیٰ عدلیہ نے قرآن وسنت کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ممتاز قادری کو پھانسی کا حکم دیا اور یہ قرار دیا کہ اسے قانون ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔سوال یہ ہے کہ کس ''قانون'' میں یہ بات لکھی ہے؟ ''اسلام کے قانون'' میں تو یہ نہیں لکھا۔ہاں

''انگریزی قانون''میں یہ درست ہوسکتا ہے۔ یہ بات آسیہ کیس میں بھی چیف جسٹس نے دہرائی ہے(پیرا14) بلکہ ممتاز قادری کیس میں ضلعی عدالت نے یہ لکھا تھا کہ ملزم نے توہین رسالت کی وجہ سے سلمان تاثیر کو قتل کیا تو شرعی لحاظ سے ٹھیک کیا لیکن دستور پاکستان اور دہشت گردی کے خلاف قوانین کی رو سے میں اسے سزائے موت دیتا ہوں۔اسلام کے نام پر بنائے گئے اس ملک میں قرآن وسنت کا اس سے بڑھ کر مذاق کیا ہوسکتا ہے کہ جج کہے کہ ملزم نے قرآن وسنت کے حکم کی تو خلاف ورزی نہیں کی البتہ پاکستان کے دستور اور فلاں قانون کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا میں اسے سزائے موت دیتا ہوں۔ یہ دین کے ساتھ کھلواڑ نہیں تو کیا ہے؟

حصہ سوم: اصلاح کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟

اس وقت جو صورتِ حال ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ سیاسی حکومت،فوج اور عدلیہ تینوں متحد ہیں اور مغربی دباؤ کے زیر اثر ہیں۔

۲۔ اگر بات کو محض قانونی انداز میں لیا جائے تو ممکن ہے عدالت عظمیٰ نظر ثانی کی درخواست قبول ہی نہ کرے (آج جمعرات ۲۲ نومبر ۲۰۱۸ء تک جب یہ سطور قلم بند کی جارہی ہیں،نظر ثانی کی درخواست قبول نہیں کی گئی) یا قبول کرلے لیکن جلد نہ سنے۔اور سنے تو جن حالات کا ہم نے ذکر کیا ہے اور ججوں کے جس مائنڈ سیٹ کا حوالہ دیا ہے تو ممکن ہے بنچ اپنا فیصلہ برقرار رکھے۔

۳۔ لہٰذا علماء کرام اور دینی جماعتوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس صورتِ حال کے خلاف ایک پرامن تحریک منظم کریں اور حکومت واسٹیبلشمنٹ پر دباؤ بڑھائیں تاکہ عدلیہ کوئی متوازن فیصلہ کرسکے۔ورنہ آسیہ رہا ہوچکی،مغربی طاقتوں کا مقصد پورا ہوچکا۔علماء اور دینی جماعتیں اب لکیر پیٹتی رہیں۔

۴۔ علماء اور دینی جماعتوں کی مشکل یہ ہے کہ تحریک لبیک نے آگے بڑھ کر،بغیر کسی دینی قوت کے ساتھ مشورے کے،ایک انتہائی قدم اٹھایا،پرتشدد تحریک چلائی اور پھر بغیر کچھ حاصل کیے پسپا ہوگئی۔اس صورتِ حال نے علماء کرام اور دینی جماعتوں کے لیے،جو پُرامن

جدوجہد کی قائل ہیں، ایک مشکل صورتِ حال کھڑی کردی ہے اور عوام کو اپنے حق میں متحرک کرنا ان کے لیے اب اتنا آسان نہیں رہا۔ اس کا حل یہ ہے کہ:

۱۔ ساری دینی جماعتیں اور ادارے متحدہ ہو جائیں اور مل کر تحریک تحفظ ناموس رسالت چلائیں۔ اپنا ہدف واضح اور محدود رکھیں۔ حکومت سے اپنی سیاسی لڑائی یا دوستی کو اس میں حائل نہ ہونے دیں۔

اس تحریک کی قیادت ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت کی طرح ثقہ، مضبوط اور سب کے لیے قابل قبول کسی بزرگ دینی رہنما کے پاس ہونی چاہیے اور یہ اس وقت تک جاری رہے جب تک اس کے مطالبات تسلیم نہ کر لیے جائیں۔

۲۔ اس کے صرف دو مطالبے ہونے چاہئیں۔ ایک فوری اور دوسرا دیرپا اور دوررس۔

۔ **فوری:** مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ نظر ثانی اپیل سپریم کورٹ کا فل کورٹ بنچ سنے اور اس کے فیصلے تک آسیہ مسیح کو گرفتار رکھا جائے۔ فل کورٹ بنچ سارے کیس کو نئے سرے سے کھنگالے اور سہ رکنی بنچ کے کمزور اور غلط فیصلے کو رد کر کے نیا فیصلہ کرے۔

حکومت سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وہ توہین رسالت کے حوالے سے مغربی دباؤ کو رد کر دے، ۲۲ کروڑ عوام کے دینی جذبات کی حمایت کرے اور نظر ثانی اپیل میں فریق بنے۔

۔ **دیرپا اور دوررس** مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ ملک کے عدالتی نظام کو اسلام کے مطابق بنایا جائے۔ موجودہ ججوں کی اسلامی قانون میں تعلیم اور اسلامی تربیت کے لیے اقدامات کیے جائیں اور آئندہ کے لیے لاء کالجز کا نصاب تعلیم و تربیت بدلا جائے اور اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے، بلکہ جدید تعلیم کے سارے نظام کو جو مغرب زدہ ہے، اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کیا جائے تاکہ مسلمان بچوں کی شخصیت نہ بگڑے، وہ کالے انگریز بننے کی بجائے یکسو اور عملی مسلمان بنیں تاکہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہو سکیں.... اور ایک مسلمان کے لیے اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہوتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

پاکستان میں توہینِ رسالت		مدیر[۱]

آسیہ مسیح کیس

دینی قوتوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟[۲]

کوئی اعلیٰ عدالت جب کسی بڑے کیس کا فیصلہ کرتی ہے تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ انسان اکثر فیصلے اپنے 'جی' سے کرتا ہے اور پھر اس کا دماغ اس فیصلے کے حق میں دلائل تراشتا ہے (fabricates arguments)۔ آسیہ مسیح کے کیس میں بھی فیصلہ ایسے ہی ہوا ہے کہ خارجی عوامل نے اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کا ایک مائنڈ سیٹ بنایا اور پھر ججوں کے دماغوں نے اس کے لیے دلائل تراشے۔ ہم نے یہ فیصلہ پڑھا ہے اور اس میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن ہم ان کا ذکر کسی الگ نشست میں کریں گے، اِس وقت یہ بات زیر غور ہے کہ اس سانحے کے بعد علماء کرام اور دینی قوتوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

احتجاج کا لائحہ عمل

۱۔ ہماری رائے میں احتجاج متحدہ، پرامن اور موثر ہونا چاہیے اور اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک یہ اپنے اہداف حاصل نہیں کر لیتا۔ اس کی قیادت ۱۹۷۴ء والی تحریک ختم نبوت کی طرح کسی ایسے عالم دین کے پاس ہونی چاہیے جو ثقہ اور سب کے لیے قابل قبول ہو اور کردار کا اتنا مضبوط ہو کہ کوئی ترغیب و ترہیب اس پر اثر انداز نہ ہو سکے (جیسے اس وقت علامہ محمد یوسف بنوریؒ تھے)۔ ہم نے غازی ممتاز قادری کی شہادت کے وقت دیکھا کہ حکومت اور ایجنسیوں نے ایسے سیاسی علماء اس تحریک میں شامل کر دیے جنہوں نے تحریک کا ٹیمپو بننے ہی نہیں دیا اور اسے کامیابی سے سبوتاژ کیا۔ اگر ہماری دینی قوتوں میں اخلاص اور فراست ہے تو انہیں اس قسم کے واقعے کو دوبارہ وقوع پذیر نہیں ہونے دینا چاہیے۔

۲۔ دینی قوتوں کی کوشش ہونی چاہیے کہ احتجاج کو پرامن رکھتے ہوئے پوری قوم کو اس

---

[۱] سیکرٹری جنرل، ملی مجلس شرعی، لاہور

[۲] یہ سطور اس دن لکھی گئیں جس دن فیصلہ سامنے آیا۔

غرض سے متحرک کرکے اپنے ساتھ ملالیں۔ یہ اتنا مشکل نہیں ہوگا کیونکہ عامۃ المسلمین اس سلسلے میں پہلے سے جذباتی ہیں۔

احتجاج کے اہداف

ا۔ اِس دفعہ نشانہ مغرب زدہ، سیکولر اور لبرل اعلیٰ عدلیہ ہونی چاہیے نہ کہ حکومت یا فوج۔ اگرچہ دینی قوتوں کو اس امر کا بھی بخوبی احساس ہونا چاہیے کہ مقابلہ اس دفعہ زیادہ مشکل ہے کیونکہ ہماری فوج، عدلیہ اور حکومت کا ٹرائیکا (تگڈم) بدقسمتی سے اسلام اور پاکستان دشمن مغربی قوتوں کی چھتری تلے متحد ہو چکا ہے جس کی قیادت فوج کے ہاتھوں میں ہے اور جس میں مغرب کا ایجنڈا اپنا تہذیبی اور سیاسی غلبہ ہے (ہم یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جاسکتے لیکن اتنا عرض ہے کہ سیاسی حکومت کی مرضی کے بغیر جنرل راحیل کا وزیرستان میں آپریشن شروع کرنا، سانحہ پشاور، نواز شریف کا اخراج، عمران خاں کا لایا جانا.... سب اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ تقریباً وہی صورت حال ہے جو مصر میں ہوئی جہاں امریکی حمایت سے فوج نے عدلیہ سے مل کر مرسی کو نکالا اور خود اقتدار پر قبضہ کرلیا اور پھر انتخابات کرا کے 'جمہوریت' (؟) بھی بحال کرلی، سوائے اس فرق کے کہ مرسی اسلام کا علم بردار تھا جبکہ نواز شریف اپنی سیاسی انا اور مالی من مانی کے لیے جمہوریت کے علم بردار بنے ہوئے تھے۔)

۲۔ علماء کرام اور دینی قیادت کی مجوزہ تحریک کے اہداف دو ہونے چاہئیں: فوری اور دیر پا۔ اس کا فوری ہدف یہ ہونا چاہیے کہ موثر احتجاج اور دباؤ سے ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں مذکورہ ٹرائیکا خصوصاً عدلیہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہوجائے۔ ہم باصرار کہتے ہیں کہ موثر احتجاج اور دباؤ کے بغیر محض قانوناً نظرثانی کے لیے عدالت عظمیٰ میں جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس تحریک کے دیرپا ہدف میں وکلاء اور ججوں کے نظام تعلیم وتربیت میں تبدیلی شامل ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حاضر سروس ججوں اور وکلاء کے لیے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی میں ان کے لیے مسلسل ایسے ریفریشر کورسز رکھے جائیں جن میں اسلامی قانون کی تعلیم اور اسلامی تربیت شامل ہو۔ علاوہ ازیں آئندہ کے لیے لاء کالجز کا نصاب بدلا جائے اور ان میں اسلامی قانون کی تعلیم اور اسلامی تربیت کو لازماً شامل کیا جائے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۶)

ہم وہ سچ کہتے ہیں جو بہت سے لوگ محسوس کرتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے

پاکستان میں توہینِ رسالت ۔ چند نا گفتہ بہ حقائق

ابوالحسن علوی

* تحریک لبیک: ناموسِ رسالت کی علمبردار یا غدار
* عمران خاں حکومت کی حماقتیں
* مولانا فضل الرحمن کی چانکیہ سیاست
* آسیہ کو پہلے دن معافی کیوں نہ دی گئی؟
* ہماری سیکولر عدلیہ

تحریک لبیک: ناموسِ رسالت کی علمبردار یا غدار

آسیہ مسیح کیس کا فیصلہ آتے ہی تحریک لبیک نے ملک بھر میں دھرنے دے کر بڑے شہر بند کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی تحریک متشدد ہو گئی۔ جلاؤ گھیراؤ اور مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ تحریک لبیک کا مؤقف یہ ہے کہ یہ غنڈہ عناصر تھے یا دوسری سیاسی جماعتوں کے بگڑے کارکن۔ بہر حال راستے بند ہونے سے زندگی معطل ہو گئی اور حکومت کی رِٹ بھی۔ عوام خوار ہو گئے۔ حکومت کے ساتھ مذاکرات ہوئے اور تین چار دن بعد تحریک لبیک نے بغیر کچھ حاصل کیے تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

تحریک لبیک کی جدوجہد کا تجزیہ کچھ یوں کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تحریک کسی دینی جماعت کے ساتھ مشاورت نہیں کرتی وہ سولو فلائٹ کی قائل ہے اور من مانی کرتی ہے۔

۲۔ پر تشدد تحریک کی اپنی نفسیات ہوتی ہے اگر اس کے پیچھے جذبہ، منصوبہ بندی اور عزم (Planning, Passion and Determination) ہو تو وہ تختہ الٹ دیتی ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ کچل دی جاتی ہے اور اگر وہ مذاکرات کر کے جدوجہد سے دست بردار ہو جائے تو اس کا مشن تباہ ہو جاتا ہے۔ عمران خاں نے تسلیم کیا کہ اگر مذاکرات کامیاب نہ ہوتے تو اس کی حکومت جا سکتی تھی (جیسا کہ ماضی میں تحریک ختم نبوت میں دولتانہ کی گئی تھی) لیکن چونکہ تحریک لبیک کے پاس پلاننگ اور عزم نہ تھا اس لیے وہ مذاکرات میں گئی۔ مذاکرات

کامیاب ہو گئے، حکومت جیت گئی اور تحریک لبیک ہار گئی اور اس کا مشن تباہ ہو گیا۔

۳۔ سوال یہ ہے کہ تحریک لبیک نے ایسا کیوں کیا؟ اگر اس نے ایسا عمداً کیا ہے تو بلاشبہ وہ ناموسِ رسالت کی غدار ہے اور اگر وہ غدار نہیں ہے تو بھی اس کی قیادت احمق اور فراست سے محروم ضرور ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی پیداوار ہے اور اسٹیبلشمنٹ نے اسے ابتداءً نواز شریف کا مذہبی ووٹ بنک ختم کرنے کے لیے کھڑا کیا تھا۔ اس نقطۂ نظر کے حامی کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے فیض آباد دھرنا اسٹیبلشمنٹ کے کہنے پر ختم کیا گیا اور اب بھی ججوں کے قتل کا فتوی اور آرمی چیف کی مذمت کے باوجود اس کی قیادت پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔

۴۔ ان لوگوں کا موقف یہ بھی ہے کہ تحریک لبیک کی ناکامی کا حتمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تحفظ ناموسِ رسالت کی تحریک کا ٹیمپو ٹوٹ گیا ہے اور اس تحریک کو نئے سر سے سے کھڑا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اسی لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ تحریک لبیک ایجنسیوں کی پیداوار ہے۔ اسے آسیہ مسیح والے فیصلے کے ردّعمل میں ناموس رسالت کی ممکنہ تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا اور اس نے یہ فریضہ وفاداری سے ادا کیا لہٰذا وہ ناموسِ رسالت کی غدار ہے، اس کی امین اور علمبردار نہیں ہے۔ ہمیں بھی ان لوگوں کا موقف صحیح لگتا ہے۔

۵۔ ہماری اسٹیبلشمنٹ جو اپنے آپ کو عقلِ کُل سمجھتی ہے۔ اس کی عقل بھی مشکوک ثابت ہوئی ہے۔ اس نے کراچی میں دینی قوتوں کا توڑ کرنے کے لیے مہاجروں کی انتہا پسند لسانی تحریک (ایم کیو ایم) کو کھڑا کیا تو کیا پایا؟ پنجاب میں اہل حدیثوں کی انتہا پسند تحریک لشکر طیبہ/ جماعۃ الدعوۃ کو کھڑا کیا تو کیا پایا؟ اب اس نے بریلوی مکتب فکر کی انتہا پسند تنظیم (تحریک لبیک) کو کھڑا کیا ہے تو اس سے کیا حاصل کر رہی ہے اور کرے گی؟ اور اسٹیبلشمنٹ کی قائم کردہ ان تینوں تحریکوں نے ملک وملت اور دین کو جو زخم دیے ہیں اور جو آئندہ دیں گی ان کا شمار کون کرے گا؟

عمران خاں حکومت کی حماقتیں

لوگ زرداری اور نواز شریف کی کرپٹ اور لادین حکومتوں سے تنگ تھے۔ پھر ان

حکومتوں اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان سرکشی بھی ایک رستا ہوا ناسور تھی۔ ان حالات میں عمران خان اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے حکمران بنے تو لوگوں کو توقع تھی کہ وہ ان غلطیوں کو نہیں دہرائیں گے جو سابقہ حکمران کرتے تھے لیکن عمران خاں نے آتے ہی وہ حماقتیں شروع کردیں جو زرداری اور نواز شریف حکومتیں کیا کرتی تھیں۔

مہنگائی کے بم سے قطع نظر جس نے عوام کی زندگی اجیرن کردی ہے، اس کی سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ اس نے توہین رسالت کے معاملے میں مغرب کا دباؤ قبول کرلیا ہے اور بائیس کروڑ عوام کے دینی جذبات سے کھیلنے بلکہ توہین رسالت جیسے حساس اور جذباتی معاملے میں رائے عامہ کے جذبات کچلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ماضی میں جب نواز شریف نے ممتاز قادری کی پھانسی کا فیصلہ کیا تھا تو ہم نے علی الاعلان کہا تھا کہ ''نواز شریف ! یہ فیصلہ دنیا اور آخرت دونوں میں تمہاری رسوائی کا سامان کرے گا''۔ دنیا میں اس کی رسوائی کا فیصلہ ہم سب نے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اور اگر اس نے اللہ سے مخلصانہ توبہ نہ کی تو یہ سنگین جرم اور گناہ اس کی آخرت بھی برباد کردے گا۔ اب یہی بات ہم دوٹوک انداز میں اور علی الاعلان عمران خاں تم سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے توہین رسالت کے معاملے میں کھلواڑ جاری رکھی تو دنیا بہت جلد تمہاری رسوائی اور ناکامی دیکھے گی اور اگر تم نے توبہ نہ کی تو تمہاری آخرت بھی برباد ہوگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت تمہیں فوج اور عدلیہ کی سرپرستی حاصل ہے، اپوزیشن دباؤ میں ہے اور بظاہر تمہارے پاؤں زمین میں خوب مضبوط گڑے نظر آتے ہیں لیکن تم بھول رہے ہو کہ جس قرآن کو تم اللہ کی کتاب مانتے ہو اس میں لکھا ہے کہ ''وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الۡخَیۡرُ ؕ''[۱] اے اللہ! تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے اور ساری خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو عمران خاں! ساری عزت اور اقتدار تمہارے ہاتھ میں نہیں اس اللہ کے اختیار میں ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے اور تم جس کے محبوب پیغمبر کی ناموس سے کھیل رہے ہو۔ ہم تمہیں تمہاری بہتری کے لیے مشورہ دیتے ہیں کہ باز آجاؤ۔ یہ اقتدار چند سال کا کھیل ہے۔ اپنی آخرت کی ہمیشہ کی زندگی اس کے لیے برباد نہ کرو۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر تم باز نہ آئے اور تم نے توبہ نہ کی تو تمہارا حشر بھی، کسی بہانے، کسی وجہ سے، نواز

[۱] آل عمران ۳:۲۶

شریف والا ہوگا۔ بہت جلد دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی رسوائی۔ بس! ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمن کی چانکیہ سیاست

ہم ان لوگوں سے متفق ہیں جو کہتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمن میکیاولی کے پرنس ہیں۔ مولانا فضل الرحمن جیسے سیاستدان کا پیدا ہونا پاکستان کی دینی تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ایک ایسا شخص جسے ہر قیمت پر، اور ہم دہراتے ہیں کہ ہر قیمت پر، اقتدار مطلوب اور عزیز ہے۔ یہ امت کی بدقسمتی ہے کہ جس جگہ وہ اپنی عیاری اور مکاری سے پہنچے ہیں اس میں کوئی ان کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ ایجنسیوں کی پیداوار ہیں۔ ہمیں ایک بزرگ دیوبندی عالم دین نے بتایا جو مفتی محمودؒ کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں کہ وہ ایک دفعہ مفتی صاحب مرحوم سے ملنے ان کے گھر گئے۔ نوجوان فضل الرحمن چائے پانی کے لیے بار بار آجا رہا تھا۔ مفتی صاحب ان سے کوئی اہم بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مفتی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے باہر صحن میں لے آئے۔ میں حیران ہوا تو کہنے لگے ’مجھے شک ہے کہ فضل الرحمن میری باتیں سی آئی ڈی کو پہنچاتا ہے اس لیے میں تمہیں باہر لے آیا ہوں‘۔ انہوں نے مولانا سمیع الحق شہید کے ساتھ جو کیا اس کی ایک معمولی جھلک تازہ البرہان میں فاروق عادل کے مضمون میں موجود ہے حالانکہ وہ مولانا فضل الرحمن کے استاد تھے۔ جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد اتحادی سیاست کے علمبردار تھے اور ایم ایم اے انہوں نے بنوائی لیکن ان کو بھی یہی گلہ تھا کہ مولانا جب چاہتے ہیں اپنے مفاد کے لیے اتحادیوں کو بیچ دیتے ہیں۔

ان کا ایک کردار تو ہم نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔ ممتاز قادری کی شہادت پر دینی قوتیں اس لیے کوئی تحریک نہ چلا سکیں کہ مولانا فضل الرحمن نواز شریف حکومت کے ساتھ تھے۔ دینی جماعتوں کا وہ زخم ابھی تازہ تھا کہ پنجاب کے مغرب زدہ اور سیکولر حکمران شاہباز شریف نے تحفظ نسواں قانون پاس کر دیا جس میں شوہروں کو کڑے لگانے کا پروگرام تھا۔ دینی سیاسی جماعتیں حکومت کے خلاف تحریک چلانے کی طرف بڑھ رہی تھیں کہ ایک شام مولانا نے اسلام آباد میں مذکورہ قانون کے خلاف زوردار بیان داغا اور حکومت کی مذمت کی۔ ان کی اشیرباد سے ساری دینی جماعتوں کی مشترکہ کانفرنس منصورہ میں ہوئی جس میں مولانا فضل

الرحمن نے دھواں دار تقریر کی۔ دوسرے دن وہ شہباز شریف سے ملے۔ان سے مل کر معاملہ دبانے کے لیے ایک کمیٹی بنوائی اور دینی جماعتوں کی سٹیرنگ کمیٹی سے مشورہ کیے بغیر اپنی مرضی سے ایک حکومتی حامی پروفیسر ساجد میر کو اس کمیٹی کا سربراہ بنا کر آ گئے۔ دینی جماعتوں کی تحریک کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور پھر کبھی کسی نے نہیں سنا کہ اس کمیٹی کا اجلاس کبھی ہوا ہو۔بس مولانا اپنا ہاتھ دکھا گئے۔

یہی کچھ وہ تحریک تحفظ ناموسِ رسالت کے معاملے میں کررہے ہیں۔آسیہ مسیح کے کیس کے فیصلے کے بعد تحریک لبیک نے آگے بڑھ کر معاملہ ہاتھ میں لے لیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی۔سپریم کورٹ کے غلط فیصلے کے بعد اس نے پُرتشدد' منظم اور مؤثر مہم چلائی۔ پھر بغیر کچھ حاصل کیے اپنا معاملہ مذاکرات میں ہار کر گھر بیٹھ گئی۔اس سے دینی لوگوں میں مایوسی پھیلی اور حکومت مخالف تحریک کا ٹیمپوٹوٹ گیا۔اب مولانا فضل الرحمن حرکت میں آ گئے۔وہ عمران خاں کے خلاف انتہائی سخت مؤقف اختیار کیے ہوئے ہیں یہاں تک کہ پیپلز پارٹی اور نون لیگ جیسی جغادری سیاسی اپوزیشن جماعتیں بھی ان کی سختی کا ساتھ نہیں دے پا رہیں۔ساری دینی سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس مجلس تحفظ ختم نبوت نے بلا رکھا تھا۔مولانا فضل الرحمن نے اس پر خاموشی سے اور متحدہ مجلس عمل کا نام استعمال کر کے قبضہ کرلیا۔ جماعت اسلامی کو بھی طوعاً وکرہاً مولانا کا ساتھ دینا پڑا۔لیکن سب لوگ سمجھتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمن کو ناموسِ رسالت کی تحریک سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ وہ اپنے ذاتی اور جماعتی بُغض اور مفادات کے لیے وہ عمران خاں سے لڑ رہے ہیں اور اس کے لیے وہ اب تحریک ناموسِ رسالت کا پلیٹ فارم استعمال کریں گے۔لیکن لوگ بھی اب ان کی چالوں کو سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی صرف اخلاص کو قبول کرتے ہیں لہٰذا ہم اطمینان سے یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ آسیہ مسیح کیس کے ردعمل میں تحفظ ناموس رسالت کی تحریک اب نہیں چل سکے گی۔ پہلے تحریک لبیک نے اس کی کمر توڑ دی اور رہی سہی کسر مولانا فضل الرحمن نے نکال دی۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دینی جماعتوں کے نفاق وانتشار کی وجہ سے اور حکومتی ایجنسیوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوچکی ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ جب ہم مولانا فضل الرحمن اور مولانا خادم رضوی کو ایجنسیوں کی پیداوار کہہ رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ دونوں بظاہر حکومت اور

اسٹیبلشمنٹ کی مخالفت کر رہے ہیں ۔ اس کے دو سبب ہیں ۔ ذہین قاری اگر ذرا گہری نظر سے دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے ۔ اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ خفیہ ایجنسیاں بعض اوقات اپنے مفاد کے لیے ہیرو اور ولن دونوں کو بیک وقت استعمال کرتی ہیں (جیسے امریکی سی آئی اے ایک طرف پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پر دباؤ ڈالتی ہے کہ قبائلی علاقوں میں آپریشن کرو اور دوسری طرف پاکستانی طالبان کو اسلحہ، ڈالر اور تربیت دیتی ہے کہ پاکستانی فوج اور حکومت سے لڑ جاؤ) ۔ دوسرے یہ کہ ایجنسیوں کے دو برانڈ ہیں ایک مقامی اور قومی اور دوسرا بین الاقوامی ۔ بنیادی طور پر مقامی ایجنسیاں ہی بندے کو خریدتی ہیں لیکن جب بکنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی 'قیمت' ہے اور جب وہ ہاتھ پاؤں پھیلا لیتا ہے اور اپنی 'تنظیم' کو موثر اور فعال بنا لیتا ہے تو وہ فطری طور پر اپنا 'ریٹ' بڑھوانا چاہتا ہے ۔ اس موقع پر بین الاقوامی ایجنسیاں بھی اس کی تاک میں ہوتی ہیں وہ اس کو فوراً اچک لیتی ہیں ۔ ہم صرف ایک مثال دے کر بات کو سمیٹیں گے کہ ایم کیو ایم مقامی ایجنسیوں نے بنوائی ، جماعت اسلامی اور جمعیت علماء پاکستان کا توڑ کرنے کے لیے ، پھر آہستہ آہستہ وہ 'را' اور سی آئی اے کے ہتھے چڑھ گئی ۔ مولانا فضل الرحمن (اور اچکزئی) کے فاٹا انضمام کی مخالفت کرنے اور نواز شریف کی حمایت کرنے (جو فوج اور عدلیہ کو ٹارگٹ کر کے ملک میں انتشار پھیلا رہا تھا) کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ گیم اوپر چلی گئی ہے اور قیمت بڑھ گئی ہے لہٰذا مولانا کی سرگرمیاں بھی تیز تر ہیں ۔ لیکن اس چیز کا امکان غالب ہے کہ جس طرح اسٹیبلشمنٹ نواز شریف کو 'کنٹرول' کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے ، وہ وقت دور نہیں جب مولانا فضل الرحمن بھی 'قابو' آ جائیں گے ۔

آسیہ مسیح کو پہلے دن معافی کیوں نہ دی گئی ؟

قرآن حکیم نے فواحش کے شیوع اور اشاعت کی مذمت کی ہے اور اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب الیم کی دھمکی دی ہے [۱] کیونکہ اس سے برائی پھیلتی ہے ، اس کا چلن عام ہوتا ہے ، شعوری یا غیر شعوری طور پر لوگوں کی توجہ اس طرف ہوتی ہے اور وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں ۔ اس سے واضح ہے کہ بری باتوں کی اشاعت نہیں کرنی چاہیے ۔ سوال یہ ہے کہ

---

[۱] النور ۲۴ : ۱۹

اس بات کا مولوی محمد قاسم کو کیوں پتہ نہیں تھا جو پنجاب میں ننکانہ کے قریب 'اِٹاں والی' گاؤں میں امام مسجد تھا اور جس کے پاس دو مسلمان عورتیں آئیں کہ فالسے چنتے ہوئے ان کی ایک عیسائی عورت سے لڑائی ہوگئی تو اس نے جواباً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی۔ سوال یہ ہے کہ جب اس عیسائی عورت آسیہ نے تسلیم کیا کہ غصے میں اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ وہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے، معافی مانگتی ہے تو مولوی قاسم نے اس کی معافی قبول کر کے معاملے کو ختم کیوں نہیں کر دیا؟

دیکھیے! پاکستان کے لوگ کی اکثریت فقہ میں حنفی مسلک رکھتی ہے اور احناف کے کئی بڑے علماء اس چیز کے قائل ہیں کہ گستاخ رسول اگر اس فعل قبیح کا عادی نہ ہو، متمرد نہ ہو، معافی مانگے، توبہ کرے تو اس کی معافی قبول کر لینی چاہیے اور اسے چھوڑ دینا چاہیے، خاص طور پر اگر وہ غیر مسلم بھی ہو۔ سوال یہ ہے کہ مولوی محمد قاسم نے اس عیسائی عورت کو معاف کیوں نہیں کیا؟ الٹا اس نے معاملے کو آگے بڑھایا اور اچھالا یہاں تک کہ وہ فوجی اور بین الاقوامی سطح کا معاملہ بن گیا، اس کی وجہ سے کئی جانیں گئیں (شہباز بھٹی، سلمان تاثیر، ممتاز قادری)۔ اس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر غیر مسلموں کو اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف وسیع پروپیگنڈے کا موقع ملا۔ آسیہ بدبخت نے جو جملے کہے، جسٹس کھوسہ نے انہیں نقل کیا اور یوں کروڑوں مسلمانوں نے وہ دل آزار جملے پڑھے اور سنے جو انہوں نے آج تک نہ پڑھے اور سنے تھے۔ سوال یہ ہے کہ مولوی قاسم نے اس برے اور دل آزار واقعے کی کیوں اشاعت کی؟ اسے کیوں بڑھایا اور پھیلایا اور اس پر مٹی ڈالنے کی بجائے اس نے جلتی پر تیل کیوں ڈالا؟ ہماری رائے میں اس نے غلط کیا اور اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئندہ بھی کسی 'عالم دین' کو مولوی قاسم جیسا رول ادا نہیں کرنا چاہیے۔

پاکستان کی سیکولر عدلیہ

'پاکستان کی عدلیہ سیکولر ہے'۔ کیا یہ کوئی خبر ہے؟ کیا یہ کوئی نئی بات ہے جسے البرہان نمایاں کر رہا ہے؟ نہیں۔ یہ ایک پرانی، گھسی پٹی بات ہے جسے سب جانتے ہیں۔ جسٹس منیر کی رپورٹ، قرارداد مقاصد کو آئین پر حاوی نہ ہونے دینا، آئین کے اسلامی ڈھانچے کو ناقابل

تغیر قرار دینا، جاگیرداری کو اسلامی قرار دینا، سود کو خلاف اسلام قرار دینا، حدود کے اسلامی قوانین پر عمل درآمد نہ کرانا، فحاشی و عریانی کو خلاف اسلام قرار نہ دینا، ممتاز قادری کو پھانسی دینا، آسیہ مسیح کو رہا کرنا.... یہ چند وہ اہم فیصلے ہیں جو عدلیہ کے سیکولر مزاج کے عکاس ہیں۔

اور کیا عدلیہ ہی سیکولر ہے؟ بیوروکریسی، فوج، سیاستدان، ایگزیکٹو، مقننہ، محکمۂ تعلیم، عدالتیں، پولیس اور دیگر ادارے سب صحیح اور اسلامی تقاضوں کے مطابق کام کر رہے ہیں؟ ہرگز نہیں! آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ ہمارا کوئی ادارہ اسلامی اصولوں کے مطابق کام نہیں کر رہا۔ سب پر مادہ پرستی، مغرب کی جمہوریت، سیکولرزم اور لبرل ازم کا بھوت سوار ہے۔

ظاہر ہے اس کے ذمہ دار پاکستانی حکمران ہیں، اسٹیبلشمنٹ ہے، ملک کے بالادست طبقے ہیں جو اسلام نہیں چاہتے، جو خود کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ انہوں نے معاشرے اور ملک کی اسلامائیزیشن کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مثلاً عدلیہ کے حوالے سے دیکھیے تو لاء کالجز میں مغربی اور پاکستانی قانون پڑھایا جاتا ہے، اسلامی شریعت نہیں۔ نہ وکیل اور جج بننے والے ان افراد کی اسلامی تربیت کی جاتی ہے۔ وکیل جس طرح بنتے اور کام کرتے ہیں اور جج جس طرح ہماری عدالتوں میں کام کرتے ہیں.... یہ سارا نظام قابل تغیر ہے لیکن اسے تبدیل کون کرے؟

حکمرانوں کو چھوڑیے ہم علماء کرام سے اور دینی جماعتوں سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے عدلیہ کے نظام کو اسلامی بنانے کے لیے کیا کیا ہے؟ دینی جماعتوں سے وابستہ افراد نے ہزاروں سکول، سیکڑوں کالج اور کئی یونیورسٹیاں بنا رکھی ہیں۔ کیا ان میں دینی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام ہے؟ کیا انہوں نے کوئی لاء کالج ایسا قائم کیا ہے جس میں شرعی قوانین کا مطالعہ کرایا جاتا ہو؟ لاء کے طلبہ کی اسلامی تربیت کی جاتی ہو؟ کیا UMT کا لاء کالج پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج سے اسلامی حوالے سے بہتر ہے؟ کیا ہمارے دینی مدارس صدیوں پہلے کے مدون کردہ فقہی متون پڑھانے کے علاوہ کچھ کرتے ہیں؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے تو علماء کرام اور دینی جماعتیں کو عدلیہ کو سیکولر بنانے کا ذمہ دار کیوں قرار نہ دیا جائے۔

تعلیم و تربیت پروفیسر طارق بٹ

بعض دینی مدارس تجدد کی نرسریاں کیوں بن رہے ہیں؟

ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ کے نومبر کے شمارے میں ''مدرسہ ڈسکورس کا سمر انٹینسو (Summer intensive) کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں سید مطیع الرحمن (صاحبِ مضمون) سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح عمار ناصر صاحب جرمنی میں ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ کے ساتھ مل کر پاکستانی مدارس کے طلبہ کو روشن خیال اور متجدد بنا رہے ہیں اور وہاں مستشرقین اور متجددین کس طرح ہمارے دینی مدارس کے طلبہ کی ذہنی تطہیر کرتے ہیں۔ اس میں صاحب مضمون بتاتے ہیں کہ وہ کلین شیو ہیں (یعنی داڑھی منڈاتے ہیں) اور پینٹ کوٹ پہنتے ہیں لیکن پھر بھی پاکستان میں مذہبی سکالر کے طور پر قابل قبول ہیں۔ اس سے پہلے الشریعہ کے ستمبر اکتوبر کے شمارے میں ایک ہندی مسلمان ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی کا مضمون اسی عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں بیان کی گئی تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ جرمنی میں اور دوسرے ممالک میں سیر سپاٹوں کے ساتھ ساتھ کافر جرمن حکومت کے بجٹ سے عمار ناصر اور دوسرے متجددین کے تعاون سے دینی مدارس کے طلبہ کو آزاد خیال اور متجدد بنا رہے ہیں۔ ازیں پیشتر اس طرح کی ایک تقریب مری بھوربن میں ایک انٹرنیشنل امریکی NGO کے تحت بھی منعقد ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ شریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ میں عمار ناصر صاحب دینی مدارس کے طلبہ کے لیے کئی پروگرام مولانا زاہد الراشدی صاحب کی زیرنگرانی منعقد کرتے ہیں جس میں غامدی تصور دین کو دینی مدارس کے طلبہ کے ذہن میں راسخ کرتے ہیں۔ ماہنامہ الشریعہ ملکی سطح پر جس طرح تجدد اور زیغ وضلال کی اشاعت اور فروغ کے لیے عمار ناصر کی ادارت میں اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کی سرپرستی میں کام کر رہا ہے وہ بھی دینی حلقوں سے مخفی نہیں ہے۔

دوسری طرف ماہنامہ صفدر نے تفصیل بہم پہنچائی ہے کہ کس طرح مفتی محمد زاہد صاحب جامعہ امدادیہ فیصل آباد میں مدرسہ کے طلبہ کو متجدد بنا رہے ہیں اور ظاہر ہے یہ کام مفتی محمد طیب صاحب مہتمم جامعہ کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جامعہ امدادیہ کے

مفتی محمد طیب صاحب اور شریعہ اکیڈمی کے مولانا زاہد الراشدی صاحب کیوں مداہنت سے کام لیتے ہیں اور دینی مدارس کے طلبہ کو متجدد بنانے کا عمل جوان کے سامنے ہورہا ہے، اس پر خاموش رہتے ہیں؟ اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وفاق کے ذمہ داران اور دیوبندی مکتب فکر کے بزرگ علماء کیوں اس صورتِ حال پر خاموش ہیں؟ اس سے پہلے علماء کرام یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ سے شاکی تھے کہ وہ متجدد پیدا کررہے ہیں لیکن اب خود دینی مدارس میں اور معروف علماء کرام کے زیر سرپرستی وزیر نگرانی روشن خیالی، تجدد اور مغرب پرستی کو عام کیا جارہا ہے۔ اگر وفاق اور مدارس کے بزرگ علماء اسی طرح خاموش اور چشم پوشی سے کام لیتے رہے تو دینی مدارس تجدد کی باقاعدہ نرسریاں بن جائیں گے اور شاعر کا یہ کہا سچ ہو جائے گا کہ ''چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟''

بقیہ: دینی قوتوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

یہاں یہ ذکر کرنا بھی بے جانہ ہوگا کہ چونکہ پرائیویٹ سیکٹر کو تعلیم میں حصہ لینے کی اجازت ہے لہٰذا دینی قوتوں کو ایسے لاء کالجز خود قائم کرنے چاہئیں جن میں جدید قوانین کے ساتھ اسلامی قانون کی تعلیم اور اسلامی تربیت کا خاطر خواہ انتظام ہو۔ بلکہ یہ معاملہ صرف قانون کی تعلیم تک محدود نہیں رہنا چاہیے اور علماء کرام و دینی قوتوں کو پاکستان میں مروج جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کا فعال اور موثر انتظام کرنا چاہیے اور دینی مدارس کے نظام تعلیم پر بھی خود ہی نظر ثانی کرنی چاہیے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ دینی عناصر الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں قدم رکھیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو ہمارے ٹی وی چینلز حکومتی دباؤ میں اس کا مکمل بائیکاٹ کردیتے ہیں اور دینی عناصر کا نقطۂ نظر پیش کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

اُمید ہے کہ علماء کرام اور دینی عناصر ہماری ان گزارشات پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے تاکہ وقتی، غیر موثر اور جذباتی احتجاج کی بجائے سوچ بچار اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس طرح احتجاج کیا جائے کہ اس کے اثرات مفید، موثر، تعمیری اور دیرپا ہوں۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

تعلیم و تربیت ادارہ

پاکستانی والدین اور اساتذہ توجہ فرمائیں

برطانوی شاہی خاندان کا ABC سکھانے کا قاعدہ

ہمیں ہمارے ماہرین تعلیم اور ہمارے دانشور کہتے ہیں کہ الف سے اللہ اور ب سے بسم اللہ غلط ہے اور الف سے انار اور ب سے بکری ہی صحیح ہے لیکن 'تعلیم یافتہ'، 'ترقی یافتہ' اور 'تہذیب یافتہ' مغرب میں برطانوی شاہی خاندان کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اپنے بچوں میں مذہبی عقائد اور تہذیبی روایات کا شعور اُجاگر کرنے کے لیے تعلیم کو ہی ذریعہ بنانا چاہیے اور یہ اصول اور روایات دورانِ تعلیم بچوں کے دل و دماغ میں بٹھانی چاہئیں۔

حال ہی میں سوشل میڈیا پر ایک وڈیو کلپ منصۂ شہود پر آیا ہے جس میں پرنس ولیم کا تین چار سالہ بیٹا (ملکۂ برطانیہ کے بیٹے چارلس کا پوتا) اپنے استاد کو ABC سنا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اس سبق کو اور داد دیجیے اپنے غلام اور پس ماندہ ذہن کے ماہرین تعلیم کو جو مملکت خداداد پاکستان میں، جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی، اپنے نظام تعلیم کو اسلام سے بچانا چاہتے ہیں اور جدیدیت اور روشن خیالی کے نام پر اسے سیکولرازم اور لبرل ازم کے مطابق رکھنا چاہتے ہیں:

A: Ask and it will be given to you Seek and you will find.

B: Be kind to one another.

C: Cast your cares on the Lord and he will sustain you.

D: Do not be anxious about anything.

E: Every good gift and perfect gift is from above.

F: For is by grace you have been saved through faith.

G: God is our refuge and strength – an ever-present help in trouble.

H: He alone is my rock and my salvation.

I: I praise you because I am fearfully and wonderfully made.

J: Jesus Christ is the same, yesterday today and forever.

K: Know that the Lord is God. It is he who made us.

L: Love the Lord our God with all your heart and all your soul.

M: My soul finds rest in God alone. My salvation comes from him.

N: Now faith is being sure of what we hope for and certain of what we do not see.

O: O God you are my God. Earnestly I seek you.

P: Praise the Lord oh my soul all my inmost being praise his holy name.

Q: A quiet spirit is of great worth in God's sight.

R: Rejoice in the Lord always and say it again rejoice.

S: Salvation belongs to our God who sits upon the throne.

T: Trust in the Lord with all your heart and lean not on your own understanding.

U: Under his wings you will find refuge, his faithfulness will be your shield.

V: Very truly I tell you the one who believes has eternal life.

w: We are more than conquerors through him who loved us.

X: May I never boast except in the cross of our Lord Jesus Christ.

Y: You are the light of the world.

Z: Zion hears and rejoices.

اعلان

زاہد حنیف صاحب اب البرہان کے ساتھ کام نہیں کرتے۔ پرچہ نہ ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان سے کتب کی خریداری کے لیے عمیر عزیز صاحب سے فون 0309-4607124 پر رابطہ کریں۔

نوٹ: ازراہ نوازش ان کاموں کے لیے مدیر البرہان کو فون نہ کیا جائے۔ ناگزیر ہو تو میسج (SMS) کر دیں۔ (ادارہ)

تعلیم و تربیت

حافظ ساجد انور[1]

دینی مدارس اور حکومتی عزائم

مملکت خداداد پاکستان میں دینی مدارس کے ساتھ روا رکھا جانے والا حکومتی رویہ کئی حوالوں سے تضادات کا شکار ہے۔ پاکستان کے دینی مدارس حکومتی رویہ و اقدامات ایسا ہمہ جہت اور وسیع و متنوع موضوع ہے جس کا کوئی سرا واضح نہیں ہے۔ بقول شاعر (ایوب خاور) ؎

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

البتہ مدارس کے ''نظام و نصاب تعلیم میں اصلاحات'' کا موضوع خوشنما اور ایک مؤثر اصطلاح ہے جس کی تعبیر ہر ہر موقع پر ارباب اختیار و اقتدار اپنے طور پر ہی کرتے ہیں۔ موجودہ حکومت کو برسر اقتدار آئے زیادہ دن نہیں گزرے لیکن مدارس کے نصاب و نظام کو بہتر بنانے اور ''علماء و طلبہ'' کو ''قومی دھارے'' میں لانے کے بیانات نے ارباب مدارس کو مضطرب کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مدارس کا ڈیٹا جمع کرنے پر مامور سیکورٹی اداروں کے بعض اہلکاروں نے ایسے پروفارمے مہتمم حضرات کو دیئے جن میں مدارس کی معلومات طلب کرنے کے ساتھ ساتھ مہتممین و مدرسین کے اہل خانہ کے کوائف اور بیوی، بیٹیوں کی تفصیلات اور رابطہ نمبرز وغیرہ تک طلب کیے گئے جس سے اشتعال و اضطراب میں مزید اضافہ ہوا۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ ایسی خبریں بھی گردش کر رہی ہیں کہ مدارس کی رجسٹریشن نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی میں کی جائے گی۔ اگرچہ موجودہ حکومت نے ان اقدامات کو پچھلی حکومت کے اقدامات کے تسلسل کا نام دیا ہے تاہم حکومتی وزراء کی طرف سے نصاب و نظام میں بہتری کے اعلانات کی وجہ سے اہل مدارس کا اضطراب کم نہیں ہوا بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اکتوبر کے پہلے عشرے میں دینی مدارس کے پانچوں بورڈز کے ذمہ داران اور سیاسی دینی جماعتوں کے قائدین نے اسلام آباد میں قومی مشاورتی کانفرنس کا انعقاد

[1] نائب قیم، جماعت اسلامی پاکستان

کیااور ۲۰ نکاتی مطالبات پیش کیے۔

ان مطالبات میں نمایاں طور پر کہا گیا کہ ایک طرف حکومت مدارس کی رجسٹریشن کی بات کرتی ہے۔ دوسری طرف رجسٹریشن تو درکنار پہلے سے رجسٹرڈ مدارس کی تجدید بھی نہیں کی جارہی ۔ مدارس کی رجسٹریشن کی راہ میں خود حکومت رکاوٹ ہے۔ ہم رجسٹریشن کے حامی ہیں۔ اسی طرح مختلف سکیورٹی اداروں کے اہلکار اپنا الگ الگ پروفا رمالے کر مدارس کے کوائف اور معلومات جمع کررہے ہیں جس کا سارا نظام ہی مشکوک ہے۔

آغا خان بورڈ کی طرح مدارس کے وفاقوں کو بھی بورڈ کا درجہ دیا جائے۔ میٹرک تک اسکول اور مدرسہ کے ایک ہی نصاب کے لیے اہل مدارس بھی تیار ہیں۔

ارباب دینی مدارس کے ساتھ مختلف ادوار میں سرکاری سطح پر مذاکرات کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔ باقاعدہ مذاکرات کا سلسلہ ۱۹۹۴ء سے جاری ہے جس میں کئی اتار چڑھاؤ آتے رہے لیکن ان مذاکرات کے نتیجے میں کبھی سرکاری اداروں یا حکومتی مشنری کے مدارس کے ساتھ تعامل میں کوئی واضح بہتری دیکھنے کو نہیں ملی۔ یعنی مذاکرات جب اور جہاں تک بھی پہنچے نتیجہ لاحاصل رہا اور ہر نئی حکومت کے آنے کے بعد مذاکرات کا سلسلہ از سرنو شروع کیا گیا۔ اس سلسلے کی سب سے اہم اور مؤثر میٹنگ ۷ ستمبر ۲۰۱۵ء کو ہوئی جس میں مدارس کے پانچوں تعلیمی بورڈز کے سربراہان کے ساتھ وزیر اعظم نواز شریف اور آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے شرکت کی۔ اس اہم اجلاس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔

موجودہ حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد بھی مدارس کے پانچوں بورڈز کے سربراہان کے ساتھ وزیر اعظم جناب عمران خان کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں وزیر مذہبی امور نور الحق قادری، وزیر تعلیم شفقت محمود، وزیر مملکت برائے داخلہ شہر یار آفریدی اور سیکرٹری وزرات مذہبی امور بھی موجود تھے۔ اس موقع پر وزیر اعظم عمران خان نے ایک کمیٹی کے قیام کا عندیہ بھی دیا جو وزیر مذہبی امور مولانا نور الحق قادری کی معاونت سے کام کرے گی اسی دن ہائر ایجوکیشن کے ذمہ داران کے ساتھ علماء کرام کے مذاکرات بھی ہوئے۔

ایسی ایک اہم میٹنگ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے مرکزی دفتر واقع اسلام آباد میں ۵ جولائی ۲۰۱۲ء کو ہوئی۔ اس اجلاس میں الشہادۃ العالمیہ کی سند کے لیے معادلہ سرٹیفکیٹ، حافظ قرآن کے سرٹیفکیٹ کو مڈل کے مساوی تسلیم کرنا، تحتانی اسناد کا معاملہ، طالبات کے لیے تعلیمی دورانیہ اور مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ وطالبات کو مروجہ NTS سے مستثنیٰ قرار دینا جیسے اہم موضوعات شامل تھے۔ اس اجلاس کے اکثر موضوعات اب بھی حل طلب ہیں کیونکہ وہ HEC کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ اس اجلاس کی رپورٹنگ کرنے والے رپورٹر کے اختتامی کلمات انتہائی اہم ہیں اور موجودہ حکومت کے نیک عزائم پر بھی صادق آسکتے ہیں۔ رپورٹر کے الفاظ یہ تھے:

''ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ مذاکرات اور ملاقاتیں صرف نشستند و برخاستند تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ اس پر عملی طور پر پیش رفت ہو۔ اس میٹنگ میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے افسران کا جو خلوص دیکھنے میں آیا وہ کہیں بیوروکریسی کے روایتی ہتھکنڈوں کی نظر نہ ہو جائے۔''

اصل مسئلہ کیا ہے؟

مدارس کے لیے حکومتی بے اعتنائی کا اصل سبب ایک خاص ذہنیت (Mind set) ہے جس کے نزدیک مدارس دہشت گردی کا نیٹ ورک ہیں۔ اہل مدارس ''قومی دھارے'' میں چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر الزامات ایک عرصہ سے مدارس پر لگائے جارہے ہیں لیکن ان میں کوئی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچا۔

اگر بعض دہشت گردوں نے مسجد و مدرسہ کا استعمال کیا ہے تو کیا کراچی یونیورسٹی سے لے کر پنجاب یونیورسٹی تک، لیاری سے لے کر نائن زیرو تک، منشیات کے اڈوں سے لے کر ریسٹ ہاؤسز تک کا استعمال دہشت گردوں نے نہیں کیا۔ لیکن ہر وقت اور ہر جگہ دہشت گردی کا طعنہ مدارس کو کیوں دیا جاتا ہے؟ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء جب آرمی پبلک سکول پشاور کا دلخراش سانحہ ہوا جس کی سب نے مذمت کی، بعدازاں نیشنل ایکشن پلان ترتیب دیا گیا اور ۲۰ نکاتی ایجنڈا ترتیب دیا گیا لیکن یہاں بھی ۲۰ نکاتی لائحہ عمل کے دیگر نکات اپنی جگہ لیکن ''نزلہ برعضو ضعیف'' کے مصداق مدارس کو ایک اور انداز سے تختہ مشق بنالیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل مدارس نے ناگفتہ بہ حالات میں بھی دین کی ترجمانی اور شعائر اسلام کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ نادار اور مستحق طلبہ وطالبات کی کفالت کی ہے اور ملک میں شرح خواندگی میں اضافہ کیا ہے۔ اہل مدارس ملک کی نظریاتی سرحدوں اور اسلامی تشخص کے محافظ ہیں۔ ایک طرف مدارس کی آمدنی کو مشکوک ٹھہرایا جاتا ہے، دوسری طرف مدارس کے اکاؤنٹ نہیں کھلوائے جاتے۔ اس حوالہ سے نواز شریف حکومت میں ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ کے بعد مدارس کے ایک نمائندہ وفد نے اسٹیٹ بینک کے ذمہ داران سے بھی ملاقات کی لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔

پس چہ باید کرد

نومنتخب حکومت کے وزیراعظیم عمران خان نے برسراقتدار آنے کے بعد اپنی تقریر میں مدینہ کی اسلامی ریاست کو ماڈل قرار دیتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے کا عندیہ دیا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ:

❁ اہل مدارس کے بنیادی مطالبات کو مدنظر رکھا جائے، محرومی کے احساس کو ختم کیا جائے اور بیوروکریسی کے روایتی تاخیری ہتھکنڈوں سے اجتناب کیا جائے۔

❁ مدارس کی رجسٹریشن وزارت تعلیم کے ساتھ کی جائے اور اس سلسلہ میں حائل رکاوٹوں کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔

❁ مدارس کے اکاؤنٹس بینکوں میں کھلوانے کے لیے آسانی فراہم کی جائے۔

❁ مدارس کے وفاقوں کو آزاد خود مختار بورڈ کی حیثیت دی جائے۔

❁ مدارس کی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں وقار اور احترام دیا جائے۔

❁ دینی مدارس کے فارغ التحصیل افراد کے لیے بھی روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

❁ ایک طرف اگر مدارس میں عصری مضامین کی تدریس ضروری ہے تو دوسری طرف عصری تعلیمی اداروں میں بھی عربی اور قرآن وحدیث کے علوم شامل کیے جائیں۔

تزکیۂ نفس انتخاب: سلیم طارق لون(۱)

بچوں کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے

اور اللہ کے ذکر میں ان کی دلچسپی کیسے بڑھائی جائے؟

ایک خاتون کہتی ہیں کہ ایک بار مَیں اپنی ایک پرانی دوست کو ملنے اس کے گھر گئی۔ میری وہ دوست مجھے بہت چاہ سے ملی اور خوشی کا اظہار کیا۔ ہم دونوں کافی عرصہ بعد ایک دوسرے سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہی تھیں۔

کچھ دیر ان کے گھر بیٹھنے کے بعد ان کی ایک چھوٹی بیٹی آئی اور کہنے لگی: امی امی! کیا ہم آج جنت میں گھر نہیں بنائیں گے؟ میں نے پہلے تو اسے سنا ان سنا کر دیا مگر وہ بچی بار بار وقفے وقفے سے اپنی امی سے یہ بات پوچھنے لگی حتیٰ کہ اس کی دوسری بہن بھی، جو اس سے کچھ بڑی تھی آ گئی اور اس نے بھی یہی سوال کیا۔ تب ان کی ماں نے بچوں کا اصرار اور میرے چہرے پر ظاہر ہونے والی سوالیہ کیفیت کو اچھی طرح بھانپ لیا تو بولیں: کیا تم دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ بچے کیا کہہ رہے ہیں اور کس طرح یہ جنت میں گھر بناتے ہیں؟ میں نے کہا بالکل، کیوں نہیں! مَیں تو ضرور دیکھنا چاہوں گی۔ اس پر وہ خاتون ایک چٹائی پر بیٹھ گئیں اور اس کے بچے اور بچیاں جو چار پانچ سال سے لے کر دس بارہ سال تک کے تھے، سب اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ پھر ان کی ماں نے پوچھا: ہاں بھائی اب ہم جنت میں گھر بنائیں؟ سب بچوں نے بیک زبان ہو کر کہا: جی۔ اس پر ان کی ماں نے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد سورۃ الاخلاص پڑھنا شروع کی اور بچے بھی اپنی ماں کے ساتھ ساتھ سورۃ الاخلاص دہرانے لگے اور دس بار انہوں نے سورۃ الاخلاص پڑھ لی۔ پھر ان کی ماں اپنے بچوں سے بولی: اب یہ بتاؤ کہ اپنے اپنے اس محل میں کوئی خزانہ بھی رکھنا چاہتے ہو؟ سب بچوں نے کہا: ہاں۔ تو پھر ماں نے لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھنا شروع کیا اور بچے بھی اپنی ماں کے ساتھ یہی کلمات دھرانے لگے۔ پھر ماں نے پوچھا: ہاں تو اب تم یہ چاہتے ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمہاری بات کا جواب بھی دیں؟ اور پھر تم قیامت کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے حوض کوثر سے پانی پیو اور پھر تمہیں

---

(۱) سابق آئی جی پولیس، اسلام آباد، ای میل: saleem.lone@gmail.com

کبھی پیاس نہ لگے؟ سب بچوں نے پھر ہاں میں جواب دیا تو اب ماں نے دورد شریف پڑھنا شروع کیا اور بچے بھی اپنی ماں کے ساتھ درود شریف پڑھنے لگے۔ پھر انہوں نے کچھ دیر سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کا بھی وِرد کیا۔ آخر میں ان کی ماں نے کہا: ٹھیک ہے بچو۔ آج جنت میں گھر بنانے کا کام پورا ہوا۔ اب جاؤ اور اپنا اپنا کام کرو، شاباش۔

مہمان خاتون یہ سب کچھ حیرت انگیز نظروں سے دیکھتی رہی۔ جب وہ اس عمل سے فارغ ہوگئیں تو میزبان خاتون کہنے لگی: دیکھیں یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ سب بچے یہ چاہتے ہیں کہ وہ کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ بیٹھیں اور اپنی ماں سے کچھ سنیں اور دل بہلائیں۔ چونکہ ہمارے یہ بچے آج کل کارٹون وغیرہ بھی دیکھتے ہیں اور اس میں یہ دیکھتے ہیں کہ کس طرح کارٹون کے کردار اپنا اپنا گھر بناتے ہیں اور اس میں اپنے لیے خزانے بھی جمع کرتے ہیں تو میں نے چاہا کہ کیوں نہ مَیں اپنے بچوں کا یہ شوق بھی پورا کروں اور ان کے لیے اچھی تربیت بھی ہو جائے، جو نہ صرف ان کی دنیا کو خوشگوار بنائے بلکہ ان کی آخرت کو بھی سنوار دے۔ بس یہی سوچ تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ ترکیب ڈال دی اور اس کا اثر تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ وہ مہمان خاتون یہ سب دیکھ کر عزم کر کے اٹھی کہ وہ بھی اپنے گھر میں ایسا ماحول بنائے گی کیوں کہ بچے پال لینا کمال نہیں۔ بچے تو جانور بھی پال لیتے ہیں۔ ان کی صحیح تربیت کرنا جانوروں اور انسانوں میں فرق کرتا ہے۔

امام کعبہ اور خشوگی

امام کعبہ شیخ صالح آل طالب کو ۲۰/اگست ۲۰۱۸ء کو گرفتار کیا گیا جس کی خبر الجزیرہ نے ۱۷/نومبر ۲۰۱۸ء کو جاری کی لیکن جمال خشوگی کے معاملے میں میڈیا روزانہ خبریں اور اس کے قتل کے بارے میں تفتیش پر فالو اَپ بھی جاری کر رہا ہے۔ ترکی کے صدر طیب اردوان نیویارک ٹائمز میں مضامین لکھ کر سعودی حکومت کو جمال خشوگی کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں لیکن امام کعبہ کی گمشدگی و گرفتاری پر ترکی کے صدر اردوان اور دنیا کے تمام ٹی وی چینلز اور صحافی مکمل خاموش ہیں۔ کیونکہ وہ ایک عالم دین تھے جبکہ جمال خشوگی مغربی فکر و تہذیب کا نمائندہ تھا۔ خشوگی کی زندگی اہم ہے اور امام کعبہ کی زندگی غیر اہم ہے۔ (میر نور احمد، کراچی)

تزکیۂ نفس　　مدیر (استفادہ از حافظ محمد موسیٰ بھٹو)

تزکیۂ نفس اور جدید اسلامی تحریکیں (آخری قسط)

جدیدیت کے پس منظر میں

اہل تزکیہ و اسلامی تحریکوں کے فہم اسلام میں فرق

....ان دونوں کے درمیان دوسرا فرق یہ ہے کہ اہل تصوف کام کا آغاز فرد کے پانچ فٹ جسم سے کرتے ہیں۔ وہ فرد کی تہذیب نفس، تزکیۂ نفس اور اصلاح نفس پر فوکس کرتے ہیں اور نفس کی حیوانی و جبلی قوتوں کو مطیع کرنے کے کام کو سارے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں وہ اپنے ساتھ وابستہ افراد کو افرادِ معاشرہ کی اصلاح کے کام پر لگاتے ہیں جب کہ اسلامی تحریکوں کا آغاز ہی حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد سے ہوتا ہے۔ ان تحریکوں کی شروعات بھی اسی کام سے ہوتی ہیں تو انتہا بھی اسی کام پر ہوتی ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ جدید اسلامی تحریکیں ہمارا سرمایہ ہیں۔ اس سرمایہ کا تحفظ، اس کی بقاء اور اس کا فروغ ہمارا اپنا کام ہے اور اس سے ملت کی ارتقاء کا کام وابستہ ہے لیکن اس سرمایہ کے تحفظ کے سلسلہ میں بعض رکاوٹیں ایسی ہیں جن کے فہم کی صورت کا پیدا ہونا دشوار ہو گیا ہے۔ ان رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ نفسی قوتوں کی کارفرمائی، ان کی مکر و فریب کی وارداتوں اور نفس کی ہولناک قوتوں کے فہم کی کمی ہے۔ اسلامی تحریکوں سے ایک بڑی لغزش جو ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں تہذیب نفس، تزکیۂ نفس اور اصلاح نفس کا کام ذیلی نوعیت کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کی وجہ سے نفس کی قابل ذکر حد تک اصلاحِ کی صورت پیدا نہیں ہو پاتی۔ اور ان تحریکوں سے وابستہ افراد کے نفسی مسائل ایسی صورت اختیار کرتے ہیں جس سے ان تحریکوں سے وابستہ افراد میں ٹوٹ پھوٹ، باہمی رنجشوں اور ایک دوسرے کے درمیان کدورتوں کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کارکنوں کے نفسی مسائل تحریکوں کے ارتقاء کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور تحریکیں داخلی نوعیت کے انتشار کا شکار رہتی ہیں۔

تزکیہ کے کام کی اہمیت

اہل تزکیہ کا کہنا ہے کہ تہذیب نفس اور تزکیۂ نفس کا کام ایسا ہے جو بہت دشوار

کام ہے لیکن یہ کام دین کے مقاصد میں شامل ہے۔ ZTTY6 ZZZ p ZZY K AyIF'' EöQrMJ Xön
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ [الجمعہ ۶۲:۲] کی قرآنی آیت جو قرآن میں چار مختلف مقامات پر آئی ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار مقاصد بعثت بیان فرمائے گئے ہیں:

۱۔ آیات پڑھ کر سنانا

۲۔ تزکیہ کرنا یعنی کفر، شرک، بدعملی و بداخلاقی اور امور جاہلیت سے نفس کو پاک وصاف کرنا

۳۔ کتاب اللہ کے احکام کی تعلیم دینا اور اس کے مضامین کی تشریح کرنا

۴۔ حکمت و دانائی، احکام کی اغراض اور شریعت کے اصول و مقاصد کی تعلیم دینا

تزکیہ سے مراد عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق کی پاکیزگی ہے۔ قرآن کریم نے تین مقامات پر تزکیہ کو ''تعلیم'' سے مقدم ذکر فرمایا ہے جس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ بقدر ضرورت تزکیہ تعلیم سے پہلے بھی ہونا چاہیے کہ تعلیم اسی وقت مفید اور بارآور ہوسکتی ہے جب قلوب میں اس کے قبول کرنے کی اہلیت اور جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ تزکیہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضان صحبت اور مکارمِ اخلاق سے حاصل ہوتا تھا اور اب بھی بقدر استعداد اللہ کے مقبول بندوں سے ربط و تعلق اور ان کی صحبت و مجالست سے حاصل ہوسکتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تعلیم کتاب و حکمت سے بھی اصل مقصود تزکیہ ہے۔ یہ نہ ہو تو ساری تعلیم بیکار ہے۔ اعمال و اخلاق کے بغیر نرے علوم و معارف کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر نہیں۔ آدمی ساری دنیا کی کتابیں چاٹ لے لیکن اگر انسانی اخلاق اور ایمانی اعمال موجود نہیں تو پڑھا لکھا جانور تو ہوسکتا ہے مگر انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ تزکیہ کے بغیر نہ ایمان کے رسوخ کی کیفیت اور یقین و اطمینان کی قوت پیدا ہوگی اور نہ اخلاق درست ہوسکیں گے۔ نہ اخلاص کی دولت ملے گی اور نہ اعمال پر مداومت نصیب ہوگی۔

دوسری چیز جس کی کمی نے اسلامی تحریکوں میں تحرک و فعالیت، خود احتسابی، مادہ پرستی کے

سیلاب میں خوداعتمادی اور کامل یقین کے ساتھ دعوتی کام کرنے، آگے بڑھنے اور اپنے لیے راہیں نکالنے میں دشواری پیدا کی ہے، وہ دل کی صلاحیتوں کے فہم اور اس کی بیداری کے کام کو ذیلی اہمیت دینا ہے جب کہ اس کے مقابلہ میں سارا زور عقل وعقلیت اور استدلال پر ہے۔ دل جن چیزوں سے بیدار ہو کر محبت، معرفت، تقویٰ، خشیت اور اللہ سے مستحکم تعلق کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، وہ عبادات اور ذکر و فکر کی محنت ہے، ان کو بھی مطلوبہ اہمیت نہ دینا ہے۔

اہل تزکیہ کا کہنا ہے کہ دل کی صلاحیتوں کی بیداری وارتقاء سے وہ استعداد پیدا ہوتی ہے جس سے فرد وافراد کی یقین کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے، اللہ کی ذات پر اعتماد بڑھتا ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات میں غلبۂ اسلام کے لیے جان فروشی سے آگے بڑھنے اور ہر طرح کے باطل سے مقابلہ کی استعداد سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔

قرآن تقویٰ، محبت، معرفت، ایمان ویقین وغیرہ کا مرکز دل کو قرار دیتا ہے:

- [illegible] [التغابن ۶۴:۱۱]

جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کے قلب کو ہدایت سے سرفراز فرماتا ہے۔

- [illegible] [الحجرات ۴۹:۳]

اور اللہ نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزما لیے ہیں۔

- [illegible] [الحج ۲۲:۴۶]

آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینے میں جو دل ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

جدید اسلامی تحریکوں کی اہمیت

ہم اس بات کو پھر دہراتے ہیں کہ جدید اسلامی تحریکیں ہمارا سرمایہ ہیں اس لیے کہ دور جدید میں علوم وفنون نے جو صورت اختیار کی ہے، مادہ پرستی اور سیکولرزم کی تیزی سے بڑھتی ہوئی فضا نے مسلم معاشرے کو جس طرح مسموم کیا ہے اور جدید مادی نظریات اور تہذیب جدید نے جس طرح مسلم ملت کے کروڑوں افراد کو جدیدیت کے طوفان میں زیروزبر کر دیا ہے، اسلامی تحریکوں کے ہاں لٹریچر، فکری قوت، جدید نوعیت کے استدلال کا سلیقہ اور افرادی ومادی وسائل موجود ہیں جو جدیدیت کے اس سیلاب کے مقابلہ میں مؤثر ہتھیار کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے اس کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کر کے اسلام کے کامل دین ہونے کے تصور کو اُجاگر کیا ہے۔ موجودہ دور میں جب کہ سارے مذاہب عملی اجتماعی زندگی میں انسانیت کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں، نیز عالمی سرمایہ دار مذہب کو پوجا پاٹ تک محدود رکھنے کے لیے بھی کوشاں ہے، تاکہ وہ انسانیت کو اپنے سرمایہ پرستی کے مفادات کے لیے استعمال کر سکے، ان حالات میں اسلامی تحریکوں کی طرف سے اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے ہزاروں صفحات کا لٹریچر تیار کرنا بڑا کارنامہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن محبت ومعرفت کی کمی، نفسی قوتوں کی تہذیب کے کام سے بے نیازی، باہم ایک دوسرے سے مشفقانہ ومحبانہ تعلقات کے فقدان اور دل کی صلاحیتوں جیسے کاموں کو ثانوی اہمیت دینے کی وجہ سے اسلامی تحریکوں میں مادیت کے اس سیلاب سے مقابلہ کے لیے فعالیت وتحرک میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں اہل تزکیہ سے استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں اس لیے کہ سارے کاموں میں بہتری، پاکیزگی، للّٰہیت اور اخلاص وغیرہ، اہل اخلاص اور اہل محبت کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے، ملت کی ساری تاریخ اس تسلسل کی شاہد ہے۔

جدید طبقات کے لیے جدید اسلامی تحریکیں ایک اعتبار سے پرائمری نوعیت کی ہیں کہ وہ ان کو جدیدیت کے مسموم اثرات سے بچا کر اسلام کے دروازے پر لا کھڑا کر دیتی ہیں۔ وہ ان کی ذہنی اور عقلی تربیت کرنے میں تو کامیاب ہوتی ہیں لیکن تزکیۂ نفس اور تہذیب نفس کے سلسلہ میں ان کے ہاں نظام کار موجود نہیں جس کی وجہ سے وہ عام طور پر زندگی بھر تزکیہ کے معالہ میں پیش قدمی نہیں کر پاتے اور سیرت وکردار میں پاکیزگی وبلندی پیدا نہیں ہو پاتی۔ عقل وعقلیت کے ساتھ دل کے وافر خزانوں میں سے کچھ حصہ ہونا ضروری ہے، اس کی صورت یہی ہے کہ صحبت صالح کے حوالے سے شکوک وشبہات کا خاتمہ ہو اور ان سے استفادہ کی صورت پیدا ہو۔ اس سے دل اور عقل کے درمیان توازن کی صورت پیدا ہوگی اور غلبہ اسلام کے لیے جدوجہد میں کئی گنا اضافہ ہوگا۔ اس نکتہ کا استحضار بھی ضروری ہے کہ نفس ایک ایسا بت خانہ ہے جس کا ادراک عقل وعقلیت کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس کے لیے دل کی صلاحیتوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ دوسری صورت میں نفس کے بت ٹوٹنے کا عمل دشوار تر ہوتا ہے اور فرد

وافرادزندگی بھرایمان کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

i ÇµVHLZöDLrZy "nöçk UöLZnbyÞrj øi çjLWy" # "YUF" OÖbç

الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ۭ [الحجرات ۴۹:۱۴]

یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا ہے، ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔

قرآن میں ایک جگہ دنیا میں دوطرح کے افراد کی نشاندہی فرمائی گئی ہے، ایک حالتِ ایمان میں رہنے والے اور دوسرے حالتِ تاریکی میں۔

nyJJyk Zi 3 LÞØEÖnÜ LZ" /hanøLNyuDnz" ±LaLey ALi k yD

فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ [الانعام ۶:۱۲۲]

کیا جوشخص مردہ تھا ہم نے اسے زندہ کیا اور اسے نور عطا کیا جس میں وہ چلتا پھرتا ہے۔ کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہو؟

ایمان کا نور بہت بڑی نعمت ہے بلکہ دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔کلمہ گوفرد کو یہ نور حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح زیرو کے بلب اور ہزار وولٹ کے بلب کی روشنی میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ایمان کی کمزور حالت اور طاقتور ایمان کی حالت کے درمیان بنیادی فرق ہوتا ہے۔اسلام کو ایسا ایمان مطلوب ہے جس میں فرد زندگی بھر کے معاملات میں نفس کے حالات کا مشاہدہ کرسکے اور محاسبۂ نفس کے ذریعہ حُب جاہ، حُب مال، حرص وہوس، جذبہ شہرت اور دوسروں کی تحقیر جیسی باطنی برائی کا قلعہ قمع کرسکے۔

اس نور کی علامتوں میں سے کچھ علامتیں یہ ہیں: سینہ کا کشادہ ہونا، آخرت میں اللہ سے ملاقات کے استحضار کا ہونا، محبت ومعرفت کی ارتقائی حالتوں کا ہونا، اسلامی شریعت کا محبوب تر ہونا، عجز وانکسار اور اپنی ذات کی نفی کا ہونا، دولت ودنیا سے بے نیازی کا ہونا، صبر وشکر کی کیفیات کا غالب ہونا، توکل کا ہونا، خوف وامید کی درمیانی حالت میں رہنا، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے یکسو ہوجانا، اللہ کے ذکر سے طبعی مناسبت کا ہونا، دینی حمیت کا حامل ہونا وغیرہ۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۳)

استفسارات　　مدیر

جماعت اسلامی بند گلی میں

سوال: مَیں جماعت اسلامی کا فعال رکن ہوں اور مَیں نے مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ جماعت یہ چاہتی تھی کہ اقتدار ان کے (یعنی صالح لوگوں کے) ہاتھ آجائے تا کہ وہ اسلامی نظام زندگی قائم کرسکیں۔ دوسری طرف ستر سال کا تجربہ یہ ہے کہ لوگ جماعت کو ووٹ نہیں دیتے یوں جماعت ایک بند گلی میں اور Dead End تک پہنچ گئی ہے اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ ستمبر کا البرہان میری نظر سے گزرا ہے۔ اس میں تجزیے اور جماعت میں خرابیوں کا تذکرہ تو بہت ہے لیکن کوئی واضح حل نظر نہیں آتا کہ جماعت اس بند گلی سے کیسے نکلے؟

جواب: ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے مولانا مودودیؒ کا لٹریچر پڑھ رکھا ہے اور جماعت کی فکر پر آپ کی نظر ہے۔ اگر آپ نے شمارہ ستمبر میں میرے مضامین دیکھے ہوں تو آپ جان گئے ہوں گے کہ جس خلجان کا آپ کو آج سامنا ہے، مولانا مودودیؒ چونکہ ذہین وفطین آدمی تھے لہٰذا اس کا احساس انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت کی شکست سے کرلیا تھا بلکہ ان کے ساتھیوں کو بھی اس کا احساس تھا جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ مجھے اسعد گیلانی مرحوم نے بتایا کہ انہوں نے مولانا مودودیؒ سے کہا کہ جماعت اسلامی محض ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اسی لیے مولانا نے جماعت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی ان کی رائے یعنی 'قیام اسلامی ریاست بذریعہ اصلاح فرد ومعاشرہ' کی طرف لوٹ جائے اور انتخابات کا راستہ اس وقت تک ترک کردے جب تک اصلاح فرد ومعاشرہ کا کام اتنا نہ ہو جائے کہ لوگوں میں صالح افراد کے ذریعے اسلامی ریاست کے قیام کی تڑپ پیدا ہو جائے۔ لیکن افسوس کہ اُس وقت کی جماعت کی قیادت نے مولانا کا مشورہ نہ مانا اور مزید افسوس یہ کہ پچاس برسوں کی مزید شکستوں کے بعد بھی جماعت کی قیادت آج بھی مولانا کے مشورے کو ماننے کو تیار نہیں اور اسے قصہ ماضی سمجھتی ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد خود مولانا نے جماعت کی تربیت اس اصول پر کی تھی کہ اسلامی نظام زندگی کے قیام کا واحد راستہ یہ ہے کہ اقتدار صالح مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے اور وہ ملک میں اسلامی انقلاب برپا کردیں اور اس کے لیے سیاسی انتخابی جدوجہد ناگزیر ہے۔ لیکن مولانا تو صاحبِ فکر تھے۔ وہ ایک نقشہ بنا کر، پھر اسے مٹا کر دوسرا نقشہ بنا سکتے تھے، لیکن ان کے علاوہ دوسرے لوگ تو مریدان باصفا اور مقلدان محض تھے لہٰذا وہ مولانا کی پہلی تربیت کے سحر سے نہ نکل سکے اور مولانا کی نظر ثانی شدہ رائے کو ہضم نہ کر سکے۔ مولانا اگر صحت مند ہوتے اور امیر جماعت ہوتے تو وہ یقیناً جماعت کا راستہ بدل دیتے لیکن تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا کہ وہ بوڑھے اور کمزور تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ جماعتی قیادت ان کی بات نہیں مانتی اور ان کے اپنی رائے پر اصرار سے جماعت میں انتشار پھیلے گا اور وہ کمزور ہو گی تو وہ خاموش ہو گئے اور پھر راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

اب اگر جماعت میں کوئی صاحب علم وفکر ہو تو مولانا کی نظر ثانی شدہ رائے کو لے کر اٹھے اور جماعت کو اس بند گلی سے نکالے لیکن مصیبت یہ ہے کہ جماعت کی موجودہ قیادت تو مریدان باصفا اور مقلدان محض پر مشتمل ہے۔ جو بات میاں طفیل محمد، چوہدری رحمت الٰہی اور ان کے ساتھیوں کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی وہ سراج الحق اور لیاقت بلوچ جیسے سیاسی کارکنوں اور ان کے ساتھیوں کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے؟ جب کہ یہ جمعیت طلبہ سے آئے ہوئے لوگ ہیں اور ان کو بچپن سے ایک ہی یک رُخی بات بتائی جارہی ہے۔ کاش جماعت میں صاحبان علم وفکر کی ایک بڑی تعداد ہوتی تو وہ مولانا کی نظر ثانی شدہ رائے کو لے کر اٹھتی اور جماعت کی پالیسی کو بدلنے کی کوشش کرتی!

لیکن ہم کہتے ہیں کہ جماعت کے ارکان وکارکنان کو اس صورتِ حال سے مایوس ہو کر ہاتھ پاؤں توڑ کر کے بیٹھ نہیں جانا چاہیے بلکہ دعوت واصلاح کا کام بھرپور طریقے سے کرنا چاہیے۔

استفسارات مدیر

جماعت اسلامی کے ارکان و کارکنان کیا کریں؟

سوال: مَیں جماعت اسلامی کا رکن ہوں۔ البرہان کا ستمبر کا شمارہ میری نظر سے گزرا ہے۔ جماعت میں بلاشبہ بہت سی خرابیاں در آئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مَیں ایک فرد کی حیثیت سے کیا کرسکتا ہوں؟ مَیں اگر ذاتی حیثیت میں جماعت کی قیادت کو کسی خرابی یا خرابیوں سے مطلع کربھی دوں تو ظاہر ہے اس سے معاملات بہتر تو نہیں ہو جائیں گے۔ میرے علم میں ہے کہ بعض ساتھیوں نے قیادت کو توجہ دلائی ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مَیں جماعت اسلامی کے موجودہ سیاسی کردار سے مطمئن نہیں ہوں تو کیا کروں؟ مَیں بحیثیت ایک فرد اور بطور رکن جماعت کیا کرسکتا ہوں؟

جواب: دیکھیے! اگر آپ جماعت کے رکن ہیں تو جماعت کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس میں در آنے والی خرابیوں کے ازالے کی کوشش کریں، اپنی ذاتی حیثیت میں بھی اور ساتھیوں کے ساتھ مشورے اور تعاون سے بھی کیونکہ دستوری ضوابط آپ کو نیک نیتی سے دوسرے ارکان سے مشورے سے نہیں روکتے۔

جہاں تک آپ کے اس سوال کا تعلق ہے کہ اب آپ کیا کریں؟ تو اگر آپ قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے تو آپ کو اس سوال کا واضح جواب مل جاتا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو جو لائحہ عمل دیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے قابل عمل ہے اور یہ قرآن حکیم میں چار دفعہ مذکور ہے۔[۱] یہ ہے ۱۔تلاوت کتاب ۲۔تعلیم کتاب ۳۔تعلیم حکمت اور ۴۔تزکیۂ نفس۔ ان آیات کی مولانا مودودیؒ اور دوسرے مفسرین نے جو وضاحت کی ہے اگر آپ اسے دیکھ لیں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ آپ کا لائحہ عمل دو نکات پر مبنی ہونا چاہیے۔ ایک اپنی ذات کے لیے اور دوسرا دیگر مسلمانوں کے لیے۔ ہم آپ کے شرح صدر کے لیے اس کی تھوڑی سی تفصیل بیان کر دیتے ہیں:

ذاتی حیثیت میں: آپ تلاوت قرآن حکیم کو اپنا معمول بنائیں، اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے آپ کے نفس کا تزکیہ ہوگا اور آپ ایک اچھے، باعمل اور

---

[۱] البقرہ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

متقی مسلمان بن سکیں گے جو آخرت میں کامیابی کے لیے آپ کو بہر قیمت مطلوب ہے۔

دوسروں کے لیے: ۱۔ آپ دعوت و اصلاح کا کام کریں یعنی قرآن کی دعوت اور اللہ کے دین کی دعوت دوسروں تک پہنچائیں (زبانی، تحریری، ذاتی ملاقاتیں، درس قرآن، تقسیم لٹریچر، آڈیو وڈیو.... غرض ہر ذریعے سے) اور ان کی تربیت کی کوشش کریں تاکہ وہ عملاً اچھے اور باعمل مسلمان بن جائیں۔

۲۔ رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعے: اس کام میں معاصر علوم اور مہارتوں کے ساتھ آپ کی اصل نیت اور جدوجہد دعوت و اصلاح کی ہونی چاہیے تاکہ آپ مسلمان بچوں کو دین کی تعلیم بھی دیں اور ان کی اسلامی تربیت بھی کریں تاکہ وہ کل کو اچھے اور باعمل مسلمان بن سکیں۔

۳۔ آپ دوسروں کو یہ بھی بتائیں کہ اسلام انفرادی زندگی کے ساتھ اجتماعی زندگی کو بھی اسلامی اصولوں کے مطابق گزارنے کی تلقین کرتا ہے لہٰذا موجودہ مسلم معاشرے کو صحیح اسلامی معاشرہ بنانا اور موجودہ مسلم ریاست کو صحیح اسلامی ریاست بنانا بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔

بقیہ: تزکیۂ نفس اور جدید اسلامی تحریکیں

غلبۂ دین کے کام میں پیش قدمی اور افراد معاشرہ کی اس کام کے لیے ذہنی و دلی ہم آہنگی کی صورت، طاقتور ایمان، دل کی صلاحیتوں کی بیداری اور نورِ ایمان کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ جب تک فرد کی شخصیت میں نفس کا بت کدہ موجودہ ہے، اس وقت تک طاقتور ایمان کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ طاقتور ایمان کے بغیر زبان سے تو اسلام جاری رہتا ہے لیکن دل غیر اللہ میں مصروف رہتا ہے اور اپنے اسلام پر ناز پیدا ہونے لگتا ہے اور دوسروں کی اسلامی فکر اور اسلامی حالت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔ اس صورت حال کی تبدیلی کے بغیر معاشرے اور ریاستی سطح پر غلبۂ اسلام کا کام ہونے کی بجائے غلبہ اسلام کی تحریک کمزور سے کمزور تر ہوکر، بالآخر تحلیل ہوجائے گی اور اس سے وابستہ افراد اس ادراک سے ہی محروم ہوں گے کہ یہ سب کچھ کیوں ہورہا ہے؟ نیز ہماری ساری کاوشوں کے باوجود معاشرہ ہمارا ساتھ دینے کے لیے کیوں تیار نہیں ہے؟ اسلامی تحریک دراصل عقل وعقلیت کے ساتھ ساتھ طاقتور ایمان ویقین اور اللہ کی محبت سے سرشار تحریک ہونی چاہیے۔ اسلامی تحریک سے وابستہ افراد کے لیے اس آخری نکتہ کا ادراک وشعور ہونا از حد ضروری ہے۔ اسی سے ان کی ساری ترقی وارتقاء وابستہ ہے۔ سارے تالے ایمان ویقین کی مضبوطی اور اللہ سے والہانہ محبت کے ذریعہ ہی کھل سکتے ہیں۔ ماضی کی ساری اسلامی تحریکوں کی فعالیت وکامیابی کا اصل محرک طاقت یہی رہی ہے۔

یادرفتگان فاروق عادل

مولانا سمیع الحق شہیدؒ۔ابوالمجاہدین

ایک لمبا تڑنگا مولوی صلاح الدین صاحب (ایڈیٹر تکبیر، کراچی) کے کمرے سے نکلا اور میرے کیبن کے دروازے پر آ کھڑا ہوا، کہا: میری مشکل کے ساتھی ہو‘‘۔ یہ پہلی بار تھی جب مَیں نے مولانا سمیع الحق کو اتنے قریب سے دیکھا اور اُن سے ہم کلامی کا شرف حاصل کیا۔ مولانا طویل قامت تو تھے ہی، پگڑی قد میں مزید اضافہ کر دیتی۔ مولانا میرے کیبن کے دروازے پر کھڑے تھے، میں ان کے احترام میں کھڑا ہوا گیا اور کہا: نہیں، مولانا! میں نے تو صرف اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری ادا کی تھی‘‘۔ مولانا نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا، میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پرجوش مصافحہ کیا اور پھر بازو پھیلا کر بغل گیر ہو گئے۔ مولانا کی وارفتگی بلاسبب نہ تھی۔ یہ واقعہ نوے کی دہائی کا ہے جب معاشرہ جنرل ضیاء الحق کے حامیوں اور مخالفین میں اس طرح تقسیم تھا کہ سماجی رشتے تک داؤ پر لگ چکے تھے۔ مولانا فضل الرحمن کی قیادت میں جمعیت علمائے اسلام تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) میں شامل رہی تھی، اس لیے عمومی طور پر اس کا جھکاؤ محترمہ بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کی طرف سمجھا جاتا تھا جب کہ ان کی مخالفت میں تشکیل پانے والے اسلامی جمہوری اتحاد کی محبتوں کا مرکز جنرل ضیاء الحق محسوس کیے جاتے تھے۔ مولانا سمیع الحق کی جمعیت علمائے اسلام سیاسی تقسیم کے اس طرف تھی اور مطمئن تھی کہ اچانک ایک روز اس پُرسکون جھیل میں اضطراب کا ایک پتھر آن گرا۔ مولانا فضل الرحمن نے اعلان کیا کہ جمعیت کے تمام دھڑوں نے ان کی قیادت کو تسلیم کر کے اپنی علیحدہ علیحدہ شناختیں ختم کر ڈالی ہیں اور مولانا سمیع الحق نے بھی نائب امیر بننا قبول کر لیا ہے۔ یہ ایک ناقابل یقین خبر تھی لیکن اس پر یقین اس لیے کیا گیا کہ فریق مخالف کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔

اتفاق سے انھی دنوں کسی کام سے میرا سرگودھا جانا ہوا جہاں سیاسی کارکنوں کے ایک بڑے مرکز حافظ سوڈا واٹر پر مولانا محمد صادق سے میری ملاقات ہوگئی۔ مولانا صادق سرگودھا میں جمعیت علمائے اسلام (ف) کے مدار المہام مولانا قاری عبدالسمیع کے انتہائی قریبی عزیز تھے لیکن دونوں خاندانوں کے درمیان کسی قدر دوری تھی جس کے سبب دونوں خاندانوں کی سیاسی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی، لہٰذا مولانا صادق اپنی خاندانی روایت کے برعکس

مولانا فضل الرحمن کی بجائے مولانا سمیع الحق کے قریب تھے اور سرگودھا میں ان کے سیاسی چہرے کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا صادق سے یہ ملاقات کئی برس کے بعد ہو رہی تھی، وہ بہت تپاک سے ملے اور مجھے حافظ سوڈا واٹر پر فالودے پر مدعو کر لیا۔

حال احوال کے بعد مولانا صادق میز پر جھکے اور مجھ سے سوال کیا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ کیا ہوا؟ عرض کیا کہ جمعیت متحد ہو گئی، بہت اچھا ہوا۔ میرے جواب پر انہوں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور کہا کہ اسی کی تو تمہیں خبر نہیں، بلکہ کسی کو بھی خبر نہیں۔ پھر انہوں نے انکشاف کیا کہ مولانا فضل الرحمن کی زیر قیادت دھڑے نے کس طرح یک طرفہ طور پر اجتماع منعقد کیا اور بالا ہی بالا اتحاد کا اعلان کر دیا۔ میرے کرید نے پر انہوں نے اس واقعے کی پوری تفصیلات بیان کر دیں۔ یہی تفصیلات تھیں جو میں نے رپورٹ کیں۔ مولانا سمیع الحق نے مجھے اپنی مشکل کا ساتھی قرار دیا تو ان کا اشارہ اسی رپورٹ کی جانب تھا کیوں کہ یہ رپورٹ ہی تھی جس کی اشاعت کے بعد سمیع الحق گروپ کو نئی زندگی مل سکی۔ ابتدائی گفتگو کے بعد جب دونوں جانب اعتماد کی فضا پیدا ہو گئی تو میں نے سوال کیا کہ مولانا! اگر اتحاد کی یہ ساری کارروائی شفاف نہ تھی اور آپ لوگوں کو اس بارے میں مکمل طور پر اعتماد میں بھی نہیں لیا گیا تو کیا وجہ تھی کہ آپ نے اس عمل کے بے نقاب ہونے کے لیے ایک صحافی کی رپورٹ کا انتظار کیا، خود کوئی آواز بلند نہ کی؟ میرا سوال سن کر ان کے چہرے پر بے چارگی کے سائے پھیل گئے اور انہوں نے نہایت دکھ کے ساتھ کہا: اس نے مجھے اس طرح دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا کہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا''۔" ان کا اشارہ مولانا فضل الرحمن کی طرف تھا۔ مولانا سمیع الحق سے میرے تعلق خاطر کی بنیاد یہی واقعہ بنا۔ اس کے بعد جب کبھی وہ کراچی تشریف لائے، انہوں نے ملاقات کی ہمیشہ ہی کوئی صورت نکالی اور میں نے جب بھی انٹرویو کے لیے درخواست کی، انہوں نے وقت کی کمی اور مصروفیات کی زیادتی کے باوجود میرے لیے وقت نکالا۔

میاں نواز شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے شریعت بل منظور کرا کے تاعمر خلیفۃ المسلمین بن جانے کی منصوبہ بندی کی تھی لیکن یہ کہتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ مولانا سمیع الحق ہی تھے جنھوں نے پاکستان میں پہلا شریعت بل تیار کر کے سینیٹ سے منظور کرایا تھا۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے نہایت دکھ کے ساتھ کہا: جب قومی اسمبلی سے اس بل کی منظوری کے آثار پیدا ہوئے تو حکومت اور اسمبلی دونوں کو تحلیل

کر دیا گیا''۔ان کی خاموشی کو دیکھ کر میں نے اپنے سوالات کی فہرست پر نگاہ ڈالی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ انہوں نے کہا: مقصد یہ ہے کہ ایک بنیاد قائم ہو جائے''۔ایک ایوان سے بل کی منظوری سے کچھ بنیاد قائم ہوئی، لیکن اس دوران کچھ ایسے واقعات رونما ہو گئے جن سے مولانا سمیع الحق، ان کے ہم خیال اور دینی طبقات بڑے پیمانے پر مایوس ہوئے۔اصل میں ہوا یوں کہ مولانا سمیع الحق اور ان کے اتحادیوں کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی چلی گئیں جن سے یہ تاثر مضبوط ہوا کہ اب ووٹ کے ذریعے اس تبدیلی کا ظہور ممکن نہیں رہا جس کی خاطر مولانا اور ان سے ملتی جلتی آدرشیں رکھنے والے بزرگوں نے کئی دہائیوں تک قربانیاں دیں اور حالات کے مدّوجذر کو دیکھتے ہوئے حکمتِ عملی میں تبدیلیاں کیں۔

یہ کم وبیش وہی دن تھے جب افغانستان میں انجینئر گلبدین حکمت یار اور کمانڈر احمد شاہ مسعود لڑلڑ کر ہلکان ہو چکے تھے اور طالبان معرکے پر معرکہ مارتے ہوئے کابل پر قابض ہو چکے تھے۔عین ان ہی دنوں اِن کا کراچی آنا ہوا اور قصرِ ناز میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔قومی زندگی میں اپنے مکتبِ فکر کی پے در پے پسپائی کے ضمن میں؛ مَیں نے ان سے سوال کیا تو لگا جیسے وہ بھرے بیٹھے تھے۔ایسی کیفیت میں وہ کسی قدر طیش اور انتہائی تیزی کے ساتھ بات کرتے، یوں لگتا جیسے ان کی رفتارِ گفتار اور خیالات کے درمیان توازن بگڑ چکا ہے۔بس، ایسی کیفیت میں وہ تیزی، ہیجان اور جذبات کے وفور میں بولتے چلے جاتے اور ہوشیار صحافیوں کے قلم تیزی سے چلتے چلے جاتے۔ایسی ہی کیفیت میں انہوں نے اس روز کہا: بس، اب ایک ہی راستہ بچا ہے اور وہ ہے خونی انقلاب کا راستہ''۔اس روز حیرت سے مَیں نے ان کا یہ سخن سنا اور ان حالات کے بارے میں سوچا جو اس اندازِ فکر کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔میں نے کوئی ضمنی سوال کیا تو اسی کیفیت میں وہ بولے: ایسا ہوا تو میں افغانستان جا پہنچوں گا اور کسی غار میں بسیرا کروں گا''۔

مولانا فی الاصل کیا تھے؟ پاکستان میں اور افغانستان میں ان کی اہمیت کیا تھی؟ ان کا دائرہ اثر مولانا فضل الرحمن سے زیادہ تھا یا کم؟ اِن سوالوں کے جواب آسان نہیں۔ممکن ہے وہ بہت سے معاملات میں بہت سوں سے پیچھے ہوں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کم یا زیادہ، طوعاً یا کرہاً لوگ ان کے آستانے پر حاضری پر مجبور ہوتے اور عمران خان کی طرح اپنی مراد پاتے۔ہماری قومی زندگی میں لوگ انہیں تا دیر اپنے اپنے انداز میں یاد کرتے رہیں گے۔

اسلام اور پاکستان　　عبدالرشید ارشد [۱]

اسرائیل جیت گیا، پاکستان ہار گیا

عنوان پڑھتے چونکیے گا نہیں، کہی جانے والی بات کا وزن محسوس کیجیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ عنوان میں سچائی کتنے فیصد ہے اور تہمت یا مبالغہ آرائی کس قدر ہے؟ ہم آپ کے سامنے چشم کشا ٹھوس حقائق پیش کرتے ہوئے فیصلہ بھی آپ ہی پر چھوڑتے ہیں، اس یقین واطمینان کے ساتھ کہ یہ سطور آپ کو ہمارا ہم نوا بنا دیں گی۔

یہ شہید جنرل ضیاء الحق کے دور کی بات ہے کہ اُردن اور اسرائیل کے مابین تنازع نے جنگ کے حالات پیدا کر دیے۔ اسرائیلی فضائیہ کا پلڑہ اُردنی فضائیہ کے مقابلے میں بھاری محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اُردن کی مدد کے لیے اپنے چند فائٹر پائلٹ وہاں بھیج دیئے جنھوں نے اسرائیلی فضائیہ کی جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا۔ اسرائیلی قیادت اس تبدیلی اور اپنی عدم برتری پر پریشان ہوگئی۔ کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ سبق سکھانے والے ہوا باز پاکستانی تھے۔

مذکورہ انکشاف پر اسرائیلی وزیر اعظم تلملا اُٹھے اور جنگ بندی کے بعد بن گوریان نے جو اُس وقت اسرائیلی وزیر اعظم تھے، بذیانی کیفیت میں پاکستان کے خلاف اپنے منصوبہ کا یوں اعلان کیا:

''عالمی صہیونی تحریک (World Zionist Movement) کو اپنے لیے پاکستان سے خطرے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور پاکستان اس کا پہلا ہدف ہونا چاہیے کیونکہ یہ نظریاتی ریاست یہودیوں کی بقا کے لیے سخت خطرہ ہے۔ اور یہ کہ سارا پاکستان عربوں سے محبت اور یہودیوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس طرح عربوں سے ان کی محبت ہمارے لیے عربوں کی دشمنی سے زیادہ خطرناک ہے لہٰذا عالمی یہودی تنظیم کو پاکستان کے خلاف فوری اقدام کرنا چاہیے۔ پاکستان کا ہمسایہ ملک بھارت ہے جس کی ہندو آبادی پاکستان کے مسلمانوں کی ازلی دشمن ہے جس پر تاریخ گواہ ہے۔ بھارت کے ہندو کی اس مسلم دشمنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، بھارت

---

[۱] دانشور، مصنف، جوہر آباد (خوشاب)

کو استعمال کرنے کے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہمیں اس دشمنی کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرتے رہنا چاہیے۔ یوں پاکستان پر کاری ضرب لگا کر ہمیں اپنے منصوبہ کی تکمیل کرنا ہے تاکہ صہیونیت کے یہ دشمن ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائیں۔‘‘[۱]

مذکورہ اقتباس کو ایک بار پھر توجہ کے ساتھ پڑھ کر ۱۹۶۷ء کے بعد بھارت کے ذریعے اسرائیلی کاروائی کا جائزہ لیجیے کہ ۱۹۷۱ء میں بھارت ہی کی ’’محنت‘‘ سے پاکستان کا مشرقی بازو کاٹ کر بنگلہ دیش بنوادیا گیا۔ بھارتی لادین ثقافت کے لیے اسلامی جمہوریہ کہلوانے والی ریاست کے دروازے کھل گئے۔ بھارتی میڈیا سے مستعار لی جانے والی ثقافت تدریجاً آگے قدم بڑھاتی گئی اور یہ قدم رکنے کی بجائے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔

آج ہم جس اسرائیلی کامیابی کا ذکر قارئین کے سامنے پیش کررہے ہیں وہ مشرقی بازو کٹنے جیسا ہی سانحہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان زرعی ملک ہے اور زراعت کے لیے پہلی بنیادی ضرورت پانی ہے۔ پانی نہ ہو تو کھیت ویران ہو جاتے ہیں۔ کھیت ویران ہوں تو آبادی خوراک سے محروم ہوگی۔ بھوکی قوم جرائم کا رُخ کرتی ہے اور جرائم جوں جوں بڑھتے ہیں آبادی میں عدم تحفظ کا احساس جڑ پکڑتا ہے۔ کیا ملکی تاریخی حقائق اس کی تائید نہیں کرتے؟

دریا خشک، نہریں خشک اور زمینیں پانی کو ترستی دیکھی جارہی ہیں۔ بھارتی ڈیم ’’اسرائیلی خواہش کا احترام‘‘ کررہے ہیں۔ صرف پاکستان کو سیلاب کا مزہ چکھانے کے لیے ان کے منہ کھلتے ہیں اور یہ ٹیوب ویلوں کے سہارے اُگی فصلوں کو بہالے جاتے ہیں۔ یوں اسرائیلی منصوبہ بندی سے بھارت کا سینہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ حکمران بھارت دوستی کے لیے بے چین دیکھے جاتے ہیں، قوم انہیں مودی سے بغلگیر ہوتے ہوئے ہشاش بشاش ٹی وی پر دیکھتی ہے اور مطمئن ہے کہ ہمسایوں سے ’’اچھے تعلقات‘‘ ہیں اور ’’جنگ کا خطرہ نہیں ہے‘‘۔ یہ ہے ہمارا فہم وادراک! ہم مشہور ضرب المثل (Know thy Enemy) ’’اپنے دشمن کو پہچانو‘‘ کو بھول چکے ہیں۔ آج کل اخبارات کسی اسرائیلی جہاز کی اسلام آباد آمد کی خبریں سنا رہے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون.

---

[۱] اسرائیلی وزیر اعظم بن گوریان کا خطاب بحوالہ ’’جیوش کرانیکل‘۹ا/اگست ۱۹۶۷ء